جلد ۸۲ جنوری ۱۹۷۵ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۲ | جنوری ۱۹۷۵ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ | عدد ۵

مقالات

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

زر سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

گذشتہ ماہ کے ترجمان القرآن کے اشارات پڑھ کر بعض احباب نے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُن میں تشنگی محسوس کرتے ہیں اور اسی ضمن میں بعض پہلوؤں کی مزید صراحت چاہتے ہیں۔ کیونکہ فاضل قارئین اس قسم کے تاثرات کا اکثر اظہار کرتے رہتے ہیں اس لیے ہم اُن کی خدمت میں یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ "اشارات" کی حیثیت محض اشارات کی ہوتی ہے۔ ان میں کسی موضوع پر جامع تبصرہ نہیں کیا جاسکتا۔ اشارات کا مقصد ہمارے نزدیک صرف یہ ہے کہ لوگوں کے اندر غور و فکر کی تحریک پیدا ہو تاکہ وہ اُمتِ مُسلمہ کے حال اور مستقبل کے بارے میں تعمیری انداز سے سوچ سکیں اور اُن کے اندر اس کی اصلاح کا جذبہ اور عزم کارفرما ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اشارات میں صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ اُمت کے سنجیدہ افراد اُن کی طرف توجہ فرما کر اُمت میں اُٹھنے والے فتنوں کا سدِّباب کرسکیں۔

یہ بات مسلمانوں کے ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ فتنہ اپنا ایک رُخ نہیں رکھتا بلکہ اَن گِنت پہلوؤں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور لاتعداد گوشوں سے حملہ کرتا ہے اس لیے جب تک ہم ان کی نوعیتوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے اسی وقت تک ہم اس کے خلاف اُبھرنے والے کسی فتنہ کا مقابلہ کامیابی سے نہیں کرسکتے۔ چونکہ کفر خواہ ہزار روپ دھار کر آئے اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ اس لیے اس کے اُٹھائے ہوئے فتنے خواہ تعداد میں لاکھوں کروڑوں ہی کیوں نہ ہوں لیکن اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً سرمایہ داری اور اشتراکیت میں بظاہر بڑا فرق محسوس ہوتا ہے اور یہ دو الگ فتنے دکھائی دیتے ہیں اور ممکن ہے کہ ان میں کوئی اختلاف بھی ہو لیکن جہاں تک اُمتِ مسلمہ کے خلاف ان کی یورشوں کا تعلق ہے اُن میں کوئی معمولی اختلاف نظر نہیں آتا۔ ان ابتدائی گذارشات

کے بعد ہم پچھلے ماہ کے اشارات کے چند تشنہ پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

آپ اگر کُفر کی یلغار کا جائزہ لیں تو آپ ایک چیز بڑی شدت کے ساتھ محسوس کریں گے کہ کُفر کو جس قدر کد اور دشمنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور دین میں ان کی مرکزی حیثیت سے ہے کسی دوسری چیز سے نہیں۔ خدا کے وجود کو نوعِ انسان کی عظیم اکثریت کسی نہ کسی طور مانتی ہی ہے مگر اس کے وجود کے مجرد اقرار سے بندگی رب کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ خدا کا انسان سے اور دنیا کی ہر دوسری مخلوق سے تقاضا یہ ہے کہ وہ جس ذات کو اپنا خالق و مالک مانتی ہے اس کی بندگی بھی کرے کیونکہ شیوہ بندگی اختیار کرنے سے ہی اس کے وجود کے اقرار میں کوئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ پھر بندگی کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو نہایت ہی قابلِ اعتماد ذریعے سے یہ معلوم ہو کہ خداوند تعالیٰ کن باتوں کو پسند اور کن باتوں کو ناپسند کرتا ہے۔ کیونکہ خدا کی پسند اور ناپسند جانے بغیر اور پھر اس کے مطابق زندگی بسر کیے بغیر وہ اس کا بندہ نہیں بن سکتا۔ مغرب کے جدید و قدیم فلاسفہ کے خیالات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایسے افراد نہایت ہی قلیل تعداد میں پائے جاتے ہیں جنہیں منکر خدا کہا جاسکتا ہو، ان میں سے بیشتر اہل علم خدا کو ماننے والے ہیں لیکن جس چیز سے انہیں انکار ہے وہ یہ ہے خدا اپنی پسند اور ناپسند بھی رکھتا ہے اور جو لوگ اس کی پسند یدہ راہ پہ گامزن ہوں انہیں اپنی نعمتوں کا مستحق قرار دیتا ہے اور جو اس راہ کو چھوڑ کر گمراہی کا راستہ اختیار کریں انہیں سزا کا مستوجب ٹھہراتا ہے۔

اِس صورتِ حال سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو خدا کے وجود کو ماننے کے باوجود خدا کی نگاہ میں اس کا انکار کرنے والے ہیں اور خالقِ کائنات قیامت کے دن اُن سے اُسی طرح معاملہ کرے گا جس طرح کہ خدا کے باغیوں سے کیا جاتا ہے۔ اُس کی نظر میں اُس کی ذات کا وہی اقرار کسی قدر و قیمت کا حامل ہے جس کے ساتھ اس کی پسند اور ناپسند کو ملحوظ خاطر رکھا جائے یا دوسرے الفاظ میں اس کے عطا کردہ ضابطہ حیات کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ ظاہر بات ہے کہ ہمیں خدا کی یہ پسند و ناپسند کسی ہاتف غیب کے ذریعے تو معلوم نہیں ہوتی بلکہ وہ ایسے برگزیدہ انسانوں کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے جنہیں خداوند تعالیٰ نے انبیاء اور رسل کا نام دیا ہے اور جن کے آخری مظہر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضور کی اس حیثیت کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک خدا کے منشا کو معلوم کرنے کا واحد قابل اعتماد ذریعہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذات اقدس ہے۔ حضورؐ کی وساطت ہی سے ہمیں خدا کی ذات اور اس کی صفات کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے، اُنہی کے ذریعہ ہمیں اس کی پسند اور ناپسند کا پتہ چلتا ہے اور ان کی حیات طیبہ ہی سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی پسند کے عین مطابق اور اُس کی ناپسند سے پوری طرح دامن بچا کر زندگی کس طرح بسر کی جاسکتی ہے۔

جو قوت بھی اسلام کے خلاف میدان عمل میں آتی ہے وہ اپنا پورا زور دین کے اندر حضورؐ کی اس مرکزی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے صرف کرتی ہے اور اس کے لیے عام طور پر تین محاذوں پہ کام کیا جاتا ہے۔ ایک محاذ پہ کام کرنے والے ہمیشہ اس بات کے کوشاں رہے ہیں اور اب بھی پوری طرح کوشاں ہیں کہ حضور سرور دو عالمؐ کی ارفع و اعلیٰ ذات اور اُن کی پاکیزہ سیرت کو معاذ اللہ داغدار کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ سیرت کی پاکیزگی یوں بھی انسان کا سب سے قیمتی جوہر ہے مگر مذہبی دائرے میں کسی انسان کی عظمت کا بہت زیادہ دارومدار اس کی پاکیزہ سیرت پر ہی ہوتا ہے۔ جس قدر کوئی شخص سیرت کے اعتبار سے پاکیزہ ہوگا اسی نسبت سے مذہبی دائرے میں اس کی برتری قائم ہوگی۔ چنانچہ انبیاء علیہم السّلام کے صحیح اور برحق ہونے پر اللہ تعالیٰ نے جس قدر شواہد پیش کیے ہیں ان میں کتاب اور معجزات کے علاوہ ان کی سیرت کی بلندی بھی شامل ہے۔ حضورؐ چونکہ قافلۂ نبوت کے سالار ہیں اس لیے ان کی حیات طیّبہ بھی پاکیزگی کا سب سے بہتر نمونہ پیش کرتی ہے اور اسلام کے دشمن اس پاکیزہ موتی پہ ہی سب سے زیادہ چھینٹے اڑاتے رہتے ہیں۔ کبھی حضورؐ کی عائلی زندگی پر زبانِ طعن دراز کی جاتی ہے اور کبھی کفر کی یلغار کو روکنے کے لیے حضورؐ نے جس انداز سے قوت کا استعمال کیا ہے اسے ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ الغرض حضورؐ کے خلاف الزامات اور اتہامات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اسلام کے ان دشمنوں نے پوری قوت سے جاری کر رکھا ہے۔

یوں تو ایسا کوئی دور نہیں گزرا جس میں یہ ناپاک مہم جاری نہ رہی ہو لیکن اس نے صلیبی جنگوں کے خاتمہ سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک خوب زور پکڑا اور اس طویل عرصہ میں حضورؐ کی یکسر بے داغ زندگی میں کیڑے ڈالنے کی مذموم کوششیں ہوتی رہیں۔ اس سلسلہ میں مغرب کے متعصب پادریوں اور دوسرے اہل علم نے جو کچھ لکھا ہے اُسے اگر جمع کیا جائے تو یہ مواد لاکھوں سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن جب ہم اہل مغرب کی ان کاوشوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اس محاذ پہ انہیں اپنی بھرپور کوششوں کے

مقابلے میں بہت ہی کم کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس کی ایک نہایت معقول وجہ ہے۔ انسان کی فطرت میں حق و صداقت سے بڑی حد تک مناسبت رکھی گئی ہے اور اسے جب بھی حق کے خلاف کسی موقف کو اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے تو وقتی طور پر تو وہ اسے اختیار کر لیتا ہے لیکن جلد ہی اس موقف کو چھوڑ کر حق کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ چند انسانوں کو تو جھوٹے پراپیگنڈے کے ذریعہ کچھ مدت تک بیوقوف بنایا جا سکتا ہے لیکن تمام انسانوں کو طویل مدت تک حقیقت سے بے خبر نہیں رکھا جا سکتا۔ اہلِ مغرب نے اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات کیے مسلمانوں نے اُن کے مُسکِت جوابات دیئے اور حقیقت حال جب کھل کر سامنے آئی تو مغرب کے پھیلائے ہوئے زہر کے اثرات بڑی تیزی سے زائل ہونے لگے اور اسلام کے دشمنوں کا یہ محاذ کافی کمزور پڑ گیا۔

اس محاذ پر پسپا ہونے کے بعد اسلام دشمن طاقتوں نے دوسرا محاذ یہ کھولا کہ حضورؐ کے مقابلے میں ایک جھوٹی نبوت کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ حضورؐ پر چونکہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لیے اُن کے بعد جو شخص بھی نبوت کا دعویدار ہوگا وہ لازمی طور پر کاذب اور مفتری ہوگا اور اس طرح خدا کی ان عنایات سے یکسر محروم ہوگا جو کسی سچے نبی کو حاصل ہوتی ہیں بلکہ وہ خدا کی پھٹکار کا مستحق ہوگا۔ اس واضح تفاوت کی وجہ سے اس کے کلمات اس ادبیت اور حکمت سے عاری ہوں گے جن سے کسی سچے نبی کا کلام مزین ہوتا ہے، اس کے فیصلوں میں نورِ نبوت کی کوئی جھلک دکھائی نہ دے گی اور اس کی سیرت پاکیزگی کی ان ساری صفات سے تہی دامن ہوگی جن سے کسی سچے نبی کی سیرت منور ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے دل میں نبوت کا جو نہایت ارفع و اعلیٰ تصور موجود ہے اور جس کی وجہ سے وہ نبی کی محبت کو زندگی کی سب سے قیمتی متاع اور اس کی پیروی کو دنیا اور آخرت کی سب سے بڑی کامرانی خیال کرتے ہیں، اسے دھچکا لگے گا۔ خانہ ساز نبوتوں کے جب نہایت ہی پست نمونے دُنیا کے سامنے آئیں گے تو لوگوں کے دلوں سے مقامِ نبوت کی غیر معمولی رفعت اور بلندی کا احساس ختم ہوگا اور وہ اس نہج پر سوچنا شروع کر دیں گے کہ یہ نبوت و رسالت وغیرہ خداوند تعالیٰ کے کوئی خاص عطیات نہیں بلکہ بعض افراد اپنے ذاتی خیالات و تصورات کو کسی زعم باطل میں گرفتار ہو کر الہامات کہنا شروع کر دیتے ہیں اور اُن کے اندر وزن پیدا کرنے کی غرض سے یہ دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ انہیں یہ خیالات خدا کی طرف سے القا ہوئے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۵۳ء میں منیر انکوائری کے موقع پر اس کمیٹی کے سامنے کئی ایسے مجذوب پیش ہوئے یا پیش کیے گئے

جو اس بات کے دعویدار تھے کہ خدا ان سے ہمکلام ہوتا ہے۔ ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس غیر سنجیدہ کارروائی کا مقصد کیا تھا لیکن حاضرین میں مذہب سے وابستگی رکھنے والے سارے حضرات کا خیال یہی تھا کہ اس قسم کی کارروائی سے مقام نبوت کی توہین ہو رہی ہے اور ان حاضرین میں سے بے دین عناصر ان سرپھرے افراد کی باتیں سن کر ایک طرف تو خندہ زن ہوتے اور دوسری طرف ان کی آڑ لے کر مقام نبوت پر اظہار خیال کرتے۔ نبوت ایک نہایت ہی ارفع و اعلیٰ مقام ہے اور جب اس مقام پر کوئی غیر نبی فائز ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ لازمی طور پر اس مقام کی رفعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کا موجب بنتا ہے۔

اسلام دشمن طاقتوں نے جھوٹی نبوت کو قوت بہم پہنچانے میں اپنا پورا زور صرف کیا ہے کیونکہ انھیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ مسلمانوں کی جس قدر تعداد اپنے اصل مرکزِ محبت و عقیدت سے ہٹ کر کسی دوسرے مرکز کی طرف منتقل ہوگی اسی نسبت سے اسلام مضمحل اور کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی دوسرے شخص کو نبی ماننے کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ جو کچھ وہ کہے اسے فرمانِ الٰہی مان کر من و عن تسلیم کیا جائے اور اس کی پیروی کو ہی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کا ذریعہ مانا جائے۔ الغرض اس کے افکار و اعمال کو حق و باطل کے پرکھنے کا واحد معیار قرار دے کر زندگی کا پورا نقشہ اس کی تعلیمات کے مطابق ازسرِنو ترتیب دیا جائے۔ اللہ کے دین کے دشمن اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اگر وہ ایک مرتبہ مسلمانوں کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری وابستگی ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اسلام کا دنیا میں کوئی وجود باقی نہ رہے گا۔ دین میں حضورؐ کی مرکزی حیثیت تسلیم کرنے کی وجہ ہی سے مسلمان فکر و عمل میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور اگر وہ اس مرکز سے ہٹ کر دوسرے مرکز کی طرف رجوع کرنے لگیں تو پھر انہیں اس دنیا سے نیست و نابود ہونے سے کوئی دوسری قوت بچا نہیں سکتی۔

جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچانا مغربی استعمار کی ایک بنیادی ضرورت بھی تھی۔ ایک مسلمان کے دل میں جس طرح خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت بالکل فطری طور پر راسخ ہوتی ہے بالکل اسی طرح اس کے ذہن میں طاغوت سے نفرت بھی پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے ہر مسلمان طاغوت کی کوئی جامع تعریف نہ کر سکے لیکن اتنی بات تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ہر فرد، ادارہ، تحریک یا

ہیئت حاکمہ جو کسی مسلمان کو اللہ کے دین سے جزوی یا کلی طور پر برگشتہ کر کے کسی دوسرے دین کی پیروی پہ آمادہ کرنے وہ طاغوت کے زمرے میں داخل ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی محبت اور طاغوت سے غیر معمولی نفرت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر دور میں طاغوت کے خلاف پوری قوت سے صف آرا رہے ہیں اور اگر کبھی اس کا تسلط قائم بھی ہوا تو اُسے ختم کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔ یہ طاغوت سے اس نفرت کا کرشمہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کے اندر ہمیشہ یہ چبھتا ہوا احساس موجود رہا ہے کہ اُن کی اجتماعی زندگی کا نقشہ اس مثالی نقشے کے مطابق نہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو دیا ہے۔ اسی خلش نے مسلمانوں کو ایک زندہ آرزو کے ساتھ زندہ رہنے کا ایک ناقابلِ تسخیر عزم بخشا ہے جس کے طفیل اُس نے تاریخ کے نہایت ہی المناک ادوار میں اور سخت بے سروسامانی کے عالم میں باطل کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا ہے۔ دُور نہ جائیے خود اس برصغیر میں مسلمانوں نے طاغوت کی یلغار کو روکنے کے لیے جو بے مثال قربانیاں دی ہیں صرف اُن پہ ایک نظر ڈالیے تو آپ کو مسلم قوم کے معاملے میں اس "پاکیزہ خلش" کی غیر معمولی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہو سکے گا۔ جلال الدین اکبر کی سطوت و جلالت کے باوجود اہلِ حق نے جس طرح اُسے غیر اسلامی سرگرمیوں سے روکا اور اس کے نتیجے میں جو مصائب و شدائد برداشت کیے، جہانگیر کے سامنے جس جرأت کے ساتھ کلمۂ حق بلند کر کے پابندِ سلاسل ہونا گوارا کیا اور انگریز جیسی ظالم اور سفاک قوم کے خلاف جس بہادری کے ساتھ بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش کیا، وہ سب اسی خلش کے مختلف مظاہر تھے۔ اسلام دشمن طاقتوں نے اس خلش کی اثر آفرینی کا اچھی طرح اندازہ کر کے اسے دُور کرنے کی جو مختلف تدابیر اختیار کیں۔ اُن میں ایک موثر تدبیر ایک نئی نبوت کا اجرا بھی تھا۔ مسلمان انگریز کی عملداری کو طاغوت کی عملداری سے تعبیر کر کے اس کے خلاف جدوجہد کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ اُن کا تجویز کردہ نظامِ حیات مسلمانوں کے نزدیک ایک طاغوتی نظام تھا کیونکہ وہ اس ضابطۂ حیات سے مغائرت رکھتا تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ان تک پہنچا تھا۔ اس بنا پر اس نظام کی بیخ کنی ان کے ایمان کا تقاضا تھا۔ انگریز نے پہلے تو اپنی عملداری کے حق میں اور پھر اپنے لائے ہوئے نظامِ حیات کے حق میں محض اس خیال سے بعض علماء اور سجادہ نشینوں سے فتوے حاصل کرنے کی کوشش کی کہ ان کے فتووں ہی سے حالات کا رُخ بدل جائے گا اور مسلمانوں کے ذہنوں میں جو یہ خیال سمایا ہوا ہے کہ ہر وہ نظام جو اسلام کی ضد ہے وہ طاغوت ہے، نکل جائے گا اور اس طرح انگریز کے حق میں فضا کسی دشواری کے بغیر سازگار ہو جائے گی۔ لیکن اس نے جب یہ محسوس کیا کہ علماءِ سوء اور دنیا پرست

پیروں کے ان فتووں سے اُسے فائدہ حاصل ہونے کے بجائے نقصان پہنچ رہا ہے تو پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمانوں کے معتقدات، ان کے فکر و نظر کے زاویوں اور محبت و عقیدت کے مرکز و محور کو کسی غیر نبی کی وساطت سے بدلنا ناممکن ہے۔ یہ وسیع تبدیلی نبوت کے ذریعے ہی لائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اُس نے اس ضرورت کے پیش نظر اپنے زلّہ خوار جسے فرنگ کی غلامی پر ناز تھا، اس کام کے لیے تیار کیا۔ آپ اگر ولیم ہنٹر کی مشہور کتاب "ہندوستانی مسلمان" کا مطالعہ کریں تو آپ اس کے بین السطور میں انگریز کی اس ضرورت کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ فاضل مصنف کا وہ باب جس میں اس نے مسلمان فقہا کے فتووں پر بحث کی ہے اس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے علماء سو کے فتووں کے منطقی مغالطوں کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ فتوے اگرچہ ہمارے حق میں دیئے گئے تھے مگر اس بنا پر انگریزی حکومت کے لیے کوئی زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکے کیونکہ ان میں تضاد پایا جاتا تھا اور ان کے صادر کرنے والے مسلم معاشرے میں قابل اعتماد اہل بصیرت کی حیثیت سے متعارف نہ تھے۔ ایک مقام پر وہ ان فتووں کے تضاد کا ذکر اس انداز سے کرتا ہے۔

"اگر ہندوستان دارالاسلام ہی ہے جیسے کہ بعض علماء لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر راسخ العقیدہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو لازمی طور پر انگریز کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہندوستان اگر قانونی اعتبار سے دارالاسلام ہے تو اس ملک کو حقیقت میں دارالاسلام بنانے کے لیے مسلمان رعایا بغاوت کرنے پر مجبور ہے۔ فقہ اسلامی کی ساری کتب میں یہ فتویٰ درج ہے اگر کوئی کافر دارالاسلام پر حملہ آور ہو یا اس کے کسی ایک حصہ پر قابض ہو جائے تو ان حالات میں ہر مسلمان مرد، عورت اور بچے پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ کافر حکمران کی عملداری کا خاتمہ کرنے کے لیے پوری طرح جدوجہد کرے...... قرآن مسلمان کو ایک فاتح کی حیثیت سے پیش کرتا ہے غلام کی حیثیت سے پیش نہیں کرتا۔ اس لیے مسلم قوم سے پُرخلوص وفاداری کی توقع رکھنا عبث اور بیکار ہے۔"

ہنٹر اپنی اس کتاب میں اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزی تعلیم حاصل کر رہا ہے وہ آہستہ آہستہ حکومت کا طرفدار بنتا جا رہا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مسلم قوم کے صالح عناصر ہمارے مخالف ہی ہیں۔ ان عناصر کو انگریز کا ہمنوا بنانے کے لیے وہ تدبیر اختیار کی گئی جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ایک شخص کو نبوت کے مقام پر فائز کر کے طاغوت کے بارے میں مسلمانوں کے احساسات و جذبات (باقی بر صفحہ ۴۵)

فصل سوم

قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان کی دعوت

(۲)

یہ اعتراض کہ سارا قرآن بیک وقت کیوں نہ نازل ہو گیا؟ جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے، اگرچہ اس سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کسی شک کی گنجائش باقی نہ رہی تھی، مگر کفارِ قریش اُس کو انسانی کلام قرار دینے کے لیے بار بار جس بات کا سہارا لیتے تھے وہ یہ تھی کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل کر دیا جاتا۔ اس کا وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا کر کے ہمارے سامنے پیش کیا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے سوچ سوچ کر تصنیف کیا جا رہا ہے۔ قرآن میں اُن کے اس اعتراض کو نقل کر کے، یا اس کی طرف اشارہ کر کے بڑے دل نشیں انداز میں ان کو بتایا گیا کہ یہ بتدریج کیوں نازل کیا جا رہا ہے اور اس تدریج کی حکمت کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا

(الفرقان - ۳۲-۳۳)

منکرین کہتے ہیں "اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اُتار دیا گیا؟" — ہاں، ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ (اے نبیؐ) اس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے) کہ جب کبھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے، اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔

یہ کفارِ مکہ کا بڑا دل پسند اعتراض تھا جسے وہ اپنے نزدیک نہایت زوردار اعتراض سمجھ کر بار بار دہراتے

تھے، مگر قرآن میں اس کے مدلل جوابات دے کر اس کا بھی پوری طرح قلع قمع کر دیا گیا۔ اُن کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ شخص خود سوچ سوچ کر، یا کسی سے پوچھ پوچھ کر اور کتابوں سے نقل کر کر کے یہ مضامین نہیں لا رہا ہے، بلکہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے تو پوری اکٹھی ایک ہی وقت کیوں نہیں آجاتی؟ خدا تو جانتا ہے کہ پوری بات کیا ہے جو وہ فرمانا چاہتا ہے۔ وہ نازل کرنے والا ہوتا تو سب کچھ بیک وقت فرما دیتا۔ یہ جو سوچ سوچ کر کبھی کچھ مضمون لایا جاتا ہے اور کبھی کچھ، یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ وحی اُوپر سے نہیں آتی، یہیں کہیں سے حاصل کی جاتی ہے، یا خود گھڑ گھڑ کر لائی جاتی ہے۔

اِس کے جواب میں قرآن کو بتدریج نازل کرنے کی بہت سی حکمتیں بیان کر دی گئی ہیں:

(۱) ایسا اس لیے کیا جا رہا ہے کہ وہ لفظ بلفظ حافظہ میں محفوظ ہو سکے، کیونکہ اس کی تبلیغ و اشاعت تحریری صورت میں نہیں بلکہ ایک اَن پڑھ نبی کے ذریعہ سے اَن پڑھ سامعین کے سامنے زبانی تقریر کی شکل میں ہو رہی ہے۔

(۲) تاکہ اُس کی تعلیمات اچھی طرح ذہن نشین ہو سکیں۔ اِس غرض کے لیے ٹھیر ٹھیر کر تھوڑی تھوڑی بات کہنا اور ایک ہی بات کو مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے بیان کرنا زیادہ مفید ہے۔

(۳) تاکہ اُس کے بتائے ہوئے طریقِ زندگی پر دل جمتا جائے۔ اس غرض کے لیے احکام و ہدایات کا بتدریج نازل کرنا زیادہ مبنی بر حکمت ہے، ورنہ اگر سارا قانون اور پورا نظامِ حیات بیک وقت بیان کر کے اُسے قائم کرنے کا حکم دے دیا جائے تو ہوش پراگندہ ہو جائیں۔ علاوہ بریں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر حکم اگر مناسب موقع پر دیا جائے تو اس کی حکمت اور رُوح زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے بہ نسبت اس کے کہ تمام احکام دفعہ وار مرتب کر کے بیک وقت دے دیے جائیں۔

(۴) تاکہ تحریکِ اسلامی کے دَوران میں، جبکہ حق اور باطل کی مسلسل کشمکش چل رہی ہو، نبی اور اُس کے پیروؤں کی ہمت بندھائی جاتی رہے۔ اِس لیے خدا کی طرف سے بار بار، وقتاً فوقتاً، موقع بموقع پیغام آنا زیادہ کارگر ہے بہ نسبت اس کے کہ بس ایک دفعہ ایک لمبا چوڑا ہدایت نامہ دے کر اُنھیں عمر بھر کے لیے دُنیا بھر کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ پہلی صورت میں آدمی محسوس کرتا ہے کہ جس خدا نے اُسے اس کام پر مامور کیا ہے وہ اس کی طرف متوجہ ہے، اس کے کام سے دلچسپی لے رہا ہے، اس کے حالات پر نگاہ رکھتا ہے، اس کی مشکلات میں رہنمائی کر رہا ہے، اور ہر ضرورت کے موقع پر اُسے شرفِ باریابی و مخاطبت عطا فرما کر اس کے ساتھ اپنے تعلق کو تازہ کرتا رہتا ہے۔ یہ چیز حوصلہ بڑھانے والی اور عزم کو مضبوط رکھنے والی ہے۔ دوسری صورت میں آدمی کو یوں محسوس

ہوتا ہے کہ بس وہ ہے اور طوفان کی موجیں۔

آخر میں نزولِ قرآن میں تدریج کا طریقہ اختیار کرنے کی ایک اور حکمت بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی شانِ نزول یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ "ہدایت" کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرنا چاہتا ہے اور اس کی اشاعت کے لیے اس نے نبی کو ایجنٹ بنایا ہے۔ بات اگر یہ ہوتی تو یہ مطالبہ بجا ہوتا کہ پوری کتاب تصنیف کر کے بیک وقت ایجنٹ کے حوالے کر دی جائے۔ لیکن دراصل اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر اور جاہلیت اور فسق کے مقابلے میں ایمان و اسلام اور اطاعت و تقویٰ کی ایک تحریک برپا کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے ایک نبی کو داعی و قائد بنا کر اٹھایا ہے۔ اس تحریک کے دوران میں اگر ایک طرف قائد اور اس کے پیرووں کو حسبِ ضرورت تعلیم اور ہدایات دینا اس نے اپنے ذمہ لیا ہے تو دوسری طرف یہ کام بھی اپنے ہی ذمہ رکھا ہے کہ مخالفین جب کبھی کوئی اعتراض یا شبہہ یا اُلجھن پیش کریں اُسے وہ صاف کر دے، اور جب بھی وہ کسی بات کو غلط معنی پہنائیں، وہ اس کی صحیح تشریح و تفسیر کر دے۔ اِن مختلف ضروریات کے لیے جو تقریریں اللہ کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں ان کے مجموعے کا نام قرآن ہے اور یہ کتابِ آئین یا کتابِ اخلاق و فلسفہ نہیں بلکہ کتابِ تحریک ہے، جس کے معرضِ وجود میں آنے کی صحیح فطری صورت یہی ہے کہ تحریک کے اوّلِ لمحۂ آغاز کے ساتھ شروع ہو اور آخری لمحات تک جیسے جیسے تحریک چلتی رہے یہ بھی ساتھ ساتھ حسبِ موقع و ضرورت نازل ہوتی رہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (النحل ۱۰۱ تا ۱۰۲)	جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں ـــ اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کرے ـــ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ان سے کہو کہ اسے تو روح القدس نے ٹھیک ٹھیک میرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے تاکہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو پختہ کرے اور فرماں برداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں فلاح و سعادت کی خوشخبری دے۔

ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے سے مراد ایک حکم کے بعد دوسرا حکم بھیجنا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ

قرآن مجید کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں اور بارہا ایک ہی معاملہ میں چند سال کے وقفوں سے یکے بعد دیگرے دو دو، تین تین حکم بھیجے گئے ہیں۔ مثلاً شراب کا معاملہ، یا زنا کی سزا کا معاملہ۔ لیکن ہم کو یہ معنی لینے میں اس بنا پر تامل ہے کہ سورۂ نحل کی یہ آیت مکی دور میں نازل ہوئی ہے، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اُس دور میں تدریج فی الاحکام کی کوئی مثال پیش نہیں آئی تھی اس لیے ہم یہاں "ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے" کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے مختلف مقامات پر کبھی ایک مضمون کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے اور کبھی وہی مضمون سمجھانے کے لیے دوسری مثال سے کام لیا گیا ہے۔ ایک ہی قصہ بار بار آیا ہے اور ہر مرتبہ اسے دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک معاملہ کبھی ایک پہلو پیش کیا گیا ہے اور کبھی اُسی معاملے کا دوسرا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک بات کے لیے کبھی ایک دلیل پیش کی گئی ہے اور کبھی دوسری دلیل۔ ایک بات ایک وقت میں مُجمل طور پر کہی گئی ہے اور دوسرے وقت میں مفصل۔ یہی چیز تھی جسے کفارِ مکہ اس بات کی دلیل ٹھیراتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، معاذ اللہ، یہ قرآن خود تصنیف کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر اس کلام کا مَنبع علمِ الٰہی ہوتا تو پوری بات بیک وقت کہہ دی جاتی۔ اللہ کسی انسان کی طرح ناقص العلم تھوڑا ہی ہے کہ سوچ سوچ کر بات کرے، رفتہ رفتہ معلومات حاصل کرتا رہے، اور ایک بات ٹھیک بیٹھتی نظر نہ آئے تو دوسرے طریقہ سے بات کرے۔ یہ تو انسانی علم کی کمزوریاں ہیں جو تمھارے اس کلام میں نظر آرہی ہیں۔

اس کے جواب میں پہلے بیان کیا گیا کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے "روح القدس" لے کر آرہی ہے۔ "روح القدس" کا لفظی ترجمہ "پاک روح" یا "پاکیزگی کی روح" ہے، اور اصطلاحاً یہ لقب حضرت جبریل کو دیا گیا ہے۔ دوسری جگہ (سورۂ شعراء میں) انھی کے لیے روح الامین کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، یعنی امانت دار روح یہاں وحی لانے والے فرشتے کا نام لینے کے بجائے اس کا لقب استعمال کرنے سے سامعین کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ اس کلام کو ایک ایسی روح لے کر آرہی ہے جو بشری کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ وہ نہ خائن ہے کہ اللہ کچھ بھیجے اور وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر کے کچھ اور بنا دے، نہ کذاب و مُفتری ہے کہ خود کوئی بات گھڑ کے اللہ کے نام سے بیان کر دے، نہ بدنیّت ہے کہ اپنی کسی نفسانی غرض کی بنا پر دھوکے اور فریب سے کام لے۔ وہ سراسر ایک مقدس و مطہر روح ہے جو اللہ کا کلام پوری امانت کے ساتھ لا کر پہنچاتی ہے۔

پھر بتایا گیا کہ اُس کے بتدریج اس کلام کو لے کر آنے اور بیک وقت سب کچھ نہ لے آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے علم و دانش میں کوئی نقص ہے، جیسا کہ تم نے اپنی نادانی سے سمجھا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی قوتِ فہم اور قوتِ اخذ میں نقص ہے جس کے سبب سے وہ بیک وقت ساری بات کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ایک وقت کی سمجھی

ہوئی بات ہی پختہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ روح القدس اس کلام کو تھوڑا تھوڑا کر کے لاتے، کبھی اجمال سے کام لے اور کبھی اُسی بات کی تفصیل بتائے، کبھی ایک طریقہ سے بات سمجھائے اور کبھی دوسرے طریقے سے، کبھی ایک پیرایۂ بیان اختیار کرے اور کبھی دوسرا، اور ایک ہی بات کو بار بار طریقے طریقے سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرے، تاکہ مختلف قابلیتوں اور استعدادوں کے طالبینِ حق ایمان لا سکیں اور ایمان لانے کے بعد علم و یقین اور فہم و ادراک میں پختہ ہو سکیں۔

اس تدریج کی دوسری مصلحت یہ بتائی گئی کہ جو لوگ ایمان لا کر فرمانبرداری کی راہ چل رہے ہیں ان کو دعوتِ اسلامی کے کام میں اور زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں جس موقع پر جس قسم کی ہدایات درکار ہوں وہ بروقت دے دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ نہ انہیں قبل از وقت بھیجنا مناسب ہو سکتا ہے، اور نہ بیک وقت ساری ہدایات دے دینا مفید ہے۔

تیسری مصلحت یہ بتائی گئی کہ فرماں برداروں کو جن مزاحمتوں اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آرہا ہے اور جس جس طرح انہیں ستایا اور تنگ کیا جا رہا ہے، اور دعوتِ اسلامی کی راہ میں مشکلات کے جو پہاڑ سدِ راہ ہو رہے ہیں، ان کی وجہ سے وہ بار بار اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ بشارتوں سے ان کی ہمت بندھائی جاتی رہے اور ان کو آخری نتائج کی کامیابی کا یقین دلایا جاتا رہے تاکہ وہ پُر اُمید رہیں اور دل شکستہ نہ ہونے پائیں۔

یہ الزام کہ کچھ دوسرے لوگ قرآن تصنیف کر کے حضورؐ کو دے رہے ہیں | پچھلے الزام کے بالکل برعکس کفارِ مکہ ایک دوسرا الزام یہ لگاتے تھے کہ حضورؐ کو اس قرآن کے تصنیف کرنے میں کچھ دوسرے لوگ مدد دے رہے ہیں اور پُرانے زمانے کی لکھی ہوئی چیزیں نقل کروا کر آپ اُن سے سُنا کرتے ہیں، اور یہ کام شب و روز ہو رہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا إِفْكُ ِافْتَرٰهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَاءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۔ وَقَالُوْا أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّأَصِيْلًا ۔ قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِيْ

جن لوگوں نے نبیؐ کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اُتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ پُرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کرواتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سُنائی جاتی ہیں۔ (اے محمدؐ) ان سے کہو کہ

يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۔ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔	اسے نازل کیا ہے اُس نے جو زمین و آسمان کا بھید جانتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے ۔

(الفرقان - ۴ تا ۶)

اُن کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص خود تو اَن پڑھ ہے ۔ مطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل کر نہیں سکتا ۔ پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا ۔ چالیس برس کی عمر تک اُن باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ جانتا تھا جو آج اِس کی زبان سے نکل رہی ہیں ۔ اب آخر یہ معلومات آ کہاں سے رہی ہیں ؟ لامحالہ اِن کا سرچشمہ کچھ اگلے لوگوں کی کتابیں ہیں جن کے اقتباسات راتوں کو چپکے چپکے ترجمہ اور نقل کرائے جاتے ہیں ، انہیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے ، اور پھر انہیں یاد کر کے ہمیں دن کو سناتا ہے ۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہلِ کتاب میں سے تھے ، پڑھے لکھے تھے اور مکّے ہی میں رہتے تھے ۔ ایک عدّاس تھا جو حُوَیطِب بن عبدالعُزّیٰ کا آزاد کردہ غلام تھا ۔ دوسرا یَسار تھا جو علاء بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام تھا ۔ اور تیسرا جَبر ، عامر بن رَبیعہ کا آزاد کردہ غلام ۔

بظاہر یہ بڑا وزنی اعتراض معلوم ہوتا ہے ۔ وحی کے دعوے کو رد کرنے کے لیے نبی کے ماخذِ علم کی نشان دہی کر دینے سے بڑھ کر وزنی اعتراض اور کیا ہو سکتا ہے ۔ مگر آدمی پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ ایسے زبردست اعتراض کے جواب میں کوئی دلیل پیش کرنے کے بجائے صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو ، صریح بے انصافی کی بات کہہ رہے ہو ، سخت جھوٹ کا طوفان اٹھا رہے ہو ، یہ تو اُس خدا کا کلام ہے جو زمین و آسمان کا بھید جانتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اُس شدید مخالفت کے ماحول میں جب ایسا زوردار اعتراض پیش کیا گیا تو اُسے یوں حقارت کے ساتھ کیوں رد کر دیا گیا ؟ اور خود مخالفین نے اس کا صاف صاف مفصل جواب کیوں نہ مانگا ؟ اُنہوں نے کیوں نہ کہا کہ ہمارے اعتراض کو محض ظلم اور جھوٹ کہہ کر بات ٹالی جا رہی ہے ۔ پھر نئے نئے مسلمان ہونے والوں کے دلوں میں اس اعتراض سے کوئی شک کیوں نہ پیدا ہوا ؟

اس کا جواب ملتا ہی کے اُس ماحول پر تھوڑا سا غور کرنے سے مل جاتا ہے جس میں یہ اعتراض کیا گیا تھا ۔

پہلی بات یہ ہے کہ مکّے کے وہ ظالم سردار جو اُس وقت ایک ایک مسلمان کو مارتے ، کوٹتے اور تنگ کرتے پھر رہے تھے اُن کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن لوگوں پر وہ الزام لگا رہے تھے کہ یہ پرانی پرانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سناتے ہیں ، ان کے گھروں پر اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر چھاپہ

مار کر وہ سارا ذخیرہ برآمد کر لیتے جو اُن کے زعم میں اُس کام کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا اور اسے عوام کے سامنے لا کر رکھ دیتے۔ بلکہ وہ عین اُس وقت چھاپہ مار سکتے تھے جب یہ کام ہو رہا ہو۔ مگر انہوں نے ایک دن بھی یہ اقدام کر کے اپنے الزام کا ثبوت پیش نہ کیا۔

پھر جن لوگوں کے نام وہ اس سلسلے میں پیش کرتے تھے وہ شہر مکّہ ہی کے رہنے والے تھے اور اُن کی قابلیتیں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ قرآن جس شان کا کلام ہے اس کے تصنیف کرنے میں یہ لوگ کسی درجے میں بھی حصّہ دار ہو سکتے ہیں۔

مزید برآں یہ لوگ دراصل چند دشمنِ اسلام سرداروں کے آزاد کردہ غلام تھے اور عرب کی قبائلی زندگی میں ایک غلام آزاد ہو کر بھی اپنے سابق مالک کی سرپرستی کے بغیر جی نہیں سکتا تھا۔ اب یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کمزور لوگ اپنے سرپرستوں کی ناراضی مول لے کر ظلم و ستم کے اُس خوفناک ماحول میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاذ اللہ نبوت کی اِس "سازش" میں شریک ہونے کی ہمت کر سکتے تھے؟

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ تینوں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے اور آپ سے وہی گہری عقیدت رکھتے تھے جو دوسرے صحابۂ کرامؓ کو آپ سے تھی۔ اِسی ایمان کی بدولت وہ بھی دوسرے صحابہ کے ساتھ ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں کون یہ باور کر سکتا تھا کہ جو لوگ خود قرآن کے تصنیف کرنے میں حصہ لے رہے ہوں وہ اُس پر اور اُس کے پیش کرنے والے نبی پر ایمان لائیں اور اُس کی عقیدت کے جرم میں ظلم و ستم برداشت کریں؟

کفار کی ہٹ دھرمی کا ایک عجیب نمونہ

اپنے ہر الزام اور اعتراض کا معقول جواب پا کر کفار کی ہٹ دھرمی نے ایک نرالی صورت اختیار کی، اور وہ یہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تو ہم اُس وقت مانتے جب یہ کسی ایسی زبان میں فرفر قرآن سناتے جس سے یہ واقف نہیں ہیں۔ قرآن اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ	اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے "کیوں نہ اِس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی۔" اِن سے کہو یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لیے یہ

اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۝ (حٰمٓ السجدہ ۴۴)

کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ اُن کا حال تو ایسا ہے جیسے اُن کو دُور سے پکارا جا رہا ہو۔

یہ اُس ہٹ دھرمی کا ایک اور نمونہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ کفار کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، عرب ہیں، عربی اُن کی مادری زبان ہے، وہ اگر عربی میں قرآن پیش کرتے ہیں تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کلام اُنھوں نے خود نہیں گھڑ لیا ہے بلکہ ان پر خدا نے نازل کیا ہے۔ اُن کے اس کلام کو خدا کا نازل کیا ہوا کلام تو اُس وقت مانا جا سکتا تھا جب یہ کسی ایسی زبان میں یکایک دھواں دھار تقریر کرنا شروع کر دیتے جسے یہ نہیں جانتے، مثلاً فارسی یا رُومی یا یونانی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب اِن کی اپنی زبان میں قرآن بھیجا گیا ہے جسے یہ سمجھ سکیں تو اِن کو یہ اعتراض ہے کہ عرب کے ذریعہ سے عربوں کے لیے عربی زبان میں یہ کلام کیوں نازل کیا گیا؟ لیکن اگر کسی دوسری زبان میں یہ بھیجا جاتا تو اُس وقت یہی لوگ یہ اعتراض کرتے کہ یہ معاملہ بھی خوب ہے، عرب قوم میں ایک عرب کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مگر کلام اُس پر ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے جسے نہ رسول سمجھتا ہے نہ قوم۔

اس طرح اُن کے اس لغو اعتراض کو رد کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انھیں یہ بھی سمجھایا گیا کہ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اُس نے تمھاری اپنی زبان میں ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جسے تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو اور یہ جان سکتے ہو کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اس سے منہ موڑ کر تم اپنا ہی نقصان کر رہے ہو۔

تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ ۲-۴)

یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔ مگر اِن لوگوں میں سے اکثر نے اس سے رُوگردانی کی اور وہ سُن کر نہیں دیتے۔

اس میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ یعنی تم جب تک چاہو یہ رٹ لگاتے رہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود تصنیف کر رہے ہیں، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کلام کا نزول

خداوندِ عالم کی طرف سے ہے۔ مزید برآں یہ ارشاد فرما کر مخاطبین کو اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اگر اس کلام کو سُن کر چین بجبیں ہوتے ہو تو تمہارا یہ غصہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہیں بلکہ خدا کے خلاف ہے، اگر اسے رَد کرتے ہو تو ایک انسان کی بات نہیں بلکہ خدا کی بات رَد کرتے ہو، اور اگر اس سے بے رُخی برتتے ہو تو ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے منہ موڑتے ہو۔

دوسری بات یہ ارشاد ہوئی کہ اس کا نازل کرنے والا وہ خدا ہے جو اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان (رحمٰن اور رحیم) ہے۔ نازل کرنے والے خدا کی دوسری صفات کے بجائے اُس کی صفتِ رحمت کا ذکر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اُس نے اپنی رحیمی کے اقتضاء سے یہ کلام نازل کیا ہے۔ اِس سے مُخاطَبین کو خبردار کیا گیا ہے کہ اس کلام سے اگر کوئی بے رُخی برتتا ہے، یا اسے رَد کرتا ہے، یا اس پر چین بجبیں ہوتا ہے تو درحقیقت اپنے آپ سے دشمنی کرتا ہے۔ یہ تو ایک نعمتِ عظمیٰ ہے جو خدا نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر انسانوں کی رہنمائی اور فلاح وسعادت کے لیے نازل کی ہے۔ خدا اگر انسان سے بے رُخی برتتا تو انھیں اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور کچھ پروا نہ کرتا کہ یہ کس گڑھے میں جا کر گرتے ہیں۔ لیکن یہ اس کا فضل وکرم ہے کہ پیدا کرنے اور روزی دینے کے ساتھ اُن کی زندگی سنوارنے کے لیے علم کی روشنی دکھانا بھی وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اسی بنا پر یہ کلام وہ اپنے ایک بندے پر نازل کر رہا ہے۔ اب اُس شخص سے بڑھ کر ناشکرا اور آپ اپنا دشمن کون ہوگا جو اس رحمت سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے اُلٹا اس سے لڑنے کے لیے دوڑے۔

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ اس کتاب کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ یعنی اس میں کوئی بات گنجلک اور پیچیدہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اس بنا پر اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر سکے کہ اس کی سمجھ میں اس کتاب کے مضامین آتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں تو صاف صاف بتایا گیا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، صحیح عقائد کون سے ہیں اور غلط عقائد کون سے، اچھے اخلاق کیا ہیں اور بُرے اخلاق کیا، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، کس طریقے کی پیروی میں انسان کی بھلائی ہے اور کس طریقے کو اختیار کرنے میں اُس کا اپنا خسارہ ہے۔ ایسی صاف اور کھلی ہوئی ہدایت کو اگر کوئی شخص رَد کرتا ہے یا اُس کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتا۔ اُس کے اِس رویّے کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود برسرِغلط رہنا چاہتا ہے۔

چوتھی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ عربی زبان کا قرآن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کسی غیر زبان میں آتا تو اہلِ عرب یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ ہم اُس زبان ہی سے نابلد ہیں جس میں خدا نے اپنی کتاب بھیجی ہے۔

لیکن یہ تو ان کی اپنی زبان میں ہے۔ اسے نہ سمجھ سکنے کا بہانا یہ نہیں بنا سکتے۔

پانچویں بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے ہے جو علم رکھتے ہیں۔ یعنی اس سے فائدہ صرف دانا لوگ ہی اُٹھا سکتے ہیں، نادان لوگوں کے لیے یہ اُسی طرح بے فائدہ ہے جس طرح ایک قیمتی ہیرا اُس شخص کے لیے بے فائدہ ہے جو ہیرے اور پتھر کا فرق نہ جانتا ہو۔

چھٹی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب بشارت دینے والی اور ڈرا دینے والی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ محض ایک تخیّل، ایک فلسفہ اور ایک نمونۂ انشا پیش کرتی ہو جسے ماننے یا نہ ماننے کا کچھ حاصل نہ ہو۔ بلکہ یہ ڈنکے پکارسے تمام دنیا کو خبردار کر رہی ہے کہ اسے ماننے کے نتائج نہایت شاندار اور نہ ماننے کے نتائج انتہائی ہولناک ہیں۔ ایسی کتاب کو صرف ایک بیوقوف ہی سرسری طور پر نظر انداز کر سکتا ہے۔

قرآن کی دعوت کو روکنے کے لیے کفار کی تدبیریں ان سب حربوں میں ناکام ہونے کے بعد ان کا آخری حربہ یہ تھا کہ کھُلی کھُلی ہٹ دھرمی پر اُتر آئیں، قرآن کی دعوت کو زبردستی روکنے کی کوشش کریں، اور جب قرآن سُنایا جانے لگے تو خوب شور مچائیں اور ہر طرف سے اس کا مذاق اُڑانے اور اس پر آوازے کسنے کے لیے ٹوٹ پڑیں۔ قرآن کریم میں ان کی یہ سب حرکات ایک ایک کر کے بیان کر دی گئیں جن سے ہر معقول آدمی کو معلوم ہو گیا کہ کفار کے پاس اب دلیل کے جواب میں دلیل نہیں ہے بلکہ اس میدان میں شکست کھا کر اب وہ زور، زبردستی اور بیہودگی سے حق کی آواز کو دبانے پر اُتر آئے ہیں۔

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ وَ فِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَیْنِنَا وَ بَیْنِکَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ۔ (حٰمٓ السجدہ - ۵)	اور انہوں نے کہہ دیا کہ جس چیز کی طرف تو ہمیں بُلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں (یعنی ہمارے دلوں تک اس کے پہنچنے کا کوئی راستہ کھُلا ہوا نہیں ہے)، ہمارے کانوں میں گرانی ہے، (یعنی ہم اسے نہیں سُنتے)، اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے (یعنی جدائی پڑ گئی ہے) پس تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کر رہے ہیں (یعنی تیری مخالفت میں سرگرم ہیں)۔
وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا	جب یہ کافر لوگ کلامِ نصیحت (قرآن) سُنتے ہیں تو

لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۝ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِينَ (القلم ۔ ۵۱ ۔ ۵۲)	ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ اپنی غضبناک نظروں سے تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے ۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو مجنون ہے ۔ حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے ۔
وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ (حم السجدہ ۔ ۲۶)	اور یہ منکرینِ حق کہتے ہیں کہ اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور شور مچا کر اس میں خلل ڈالو شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ ۔
فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ (المعارج ۳۶ ۔ ۳۷)	پس (اے نبیؐ) کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے تمہاری طرف دوڑے چلے آرہے ہیں ؟

" یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر مذاق اُڑانے اور آوازے کسنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے ۔"

فصل چہارم

آخرت پر ایمان لانے کی دعوت

دعوتِ اسلامی کا چوتھا نکتہ یہ تھا کہ لوگ آخرت پر ایمان لائیں ۔ یہ ایک محض مختصر سا نکتہ نہ تھا بلکہ اس میں بہت سی اہم حقیقتیں شامل تھیں جنہیں تسلیم کرنے کا مجموعی نام ایمان بالآخرۃ تھا ۔

اوّل یہ کہ دنیا میں انسان غیر ذمہ دار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ یہاں جو کچھ بھی وہ چاہے کرتا رہے ، کوئی اُس سے باز پرس کرنے والا نہ ہو ۔ بلکہ یہ دُنیا دارالامتحان ہے جس میں انسان آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے ، اور جو کچھ بھی وہ یہاں کرتا ہے اس کی جواب دہی اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے کرنی ہوگی ۔

دوم یہ کہ اس جواب دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔ نوعِ انسانی کو دنیا میں کام کرنے کے لیے جتنی مہلت دینے کا اللہ فیصلہ فرما چکا ہے، اس کے ختم ہونے پر قیامت برپا ہوگی جس میں یہ سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظامِ عالم قائم کیا جائے گا اور ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جتنے انسان گذر چکے ہوں گے وہ سب بیک وقت زندہ کر کے از سرِ نو اُس عالم میں اُٹھائے جائیں گے۔ یہ دوسری زندگی دنیا کی موجودہ زندگی کی طرح عارضی نہیں بلکہ ابدی ہوگی۔ موت اس میں کبھی نہ آئے گی۔

سوم یہ کہ اُس وقت تمام اگلے پچھلے انسانوں کو جمع کر کے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اور وہاں ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں اُن اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی جو اُس نے خود اپنی ذمہ داری پر دنیا میں کیے ہوں گے۔

چہارم یہ کہ دنیا میں انسان جو کچھ بھی کر رہا ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ اس کو خود براہِ راست جانتا ہے، مگر عدل کی تمام شرائط پوری کرنے کے لیے وہ اُس کا مکمل اور بالکل صحیح نامۂ اعمال تیار کرا رہا ہے۔ بے شمار شہادتیں اس کے ایک ایک قول و فعل کے لیے فراہم کر رہا ہے خواہ وہ اس نے علانیہ کیا ہو یا چھپ کر۔ بلکہ جس نیت اور جس ارادے سے اس نے کوئی بات کی یا کہی ہے اور جو جو خیالات اُس نے اپنے دل میں رکھے ہیں، ان سب کا ثبوت بھی وہ محفوظ کرتا جا رہا ہے۔ پھر اس بات کے گواہ بھی اُس نے تیار کر رکھے ہیں کہ انسان کو حق اور باطل کا فرق سمجھانے اور غلط راستوں کے درمیان سیدھا راستہ بتانے کے لیے اُس کی طرف سے پورا انتظام کر دیا گیا تھا۔ یہ سب شہادتیں اللہ کی عدالت میں اس شان سے پیش ہوں گی کہ انسان ان کا انکار نہ کر سکے گا۔

پنجم یہ کہ اللہ کی عدالت میں کوئی رشوت، بے جا سفارش، اور خلافِ حق وکالت نہ چل سکے گی۔ کسی کا بوجھ کسی دوسرے پر ڈالا جائے گا اور نہ کوئی عزیز سے عزیز اور قریب سے قریب شخص اپنے عزیز و قریب کا بوجھ اپنے اُوپر لے گا۔ جن واقعی یا خیالی ہستیوں کو آدمی اپنا ولی و ناصر سمجھتا ہے وہ اس کے کسی کام نہ آئیں گی۔ انسان وہاں تنِ تنہا بالکل بے یار و مددگار کھڑا ہوا اپنے کارنامۂ حیات کا حساب آپ دے رہا ہوگا۔ اور فیصلہ بالکل اللہ کے اختیار میں ہوگا۔

ششم یہ کہ فیصلے کا مدار کلیتہً اِس بات پر ہوگا کہ انسان نے دنیا میں انبیاء کے بتائے ہوئے حق کو مان کر اس کے مطابق اللہ کی ٹھیک ٹھیک بندگی کی یا نہیں، اور آخرت میں اپنی جواب دہی کے احساس کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی بسر کی یا اسے بھول کر سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتا رہا۔ پہلی صورت میں اس کے لیے جنت ہے اور دوسری صورت میں جہنم۔

یہ آخرت کا عقیدہ اسلامی دعوت کے لیے اُتنا ہی اہم ہے جتنا توحید، رسالت اور قرآن کو کلام الٰہی ماننے کا عقیدہ ہے۔ کیونکہ اسلام جس طرزِ فکر و عمل کی طرف بلاتا ہے اور جس راہ پر چلنے کی دعوت دیتا ہے اس پر ایک قدم بھی انسان نہیں چل سکتا جب تک دُنیا کو امتحان گاہ اور اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ نہ سمجھ لے۔ اور جب تک اُس کے دماغ سے یہ خیال نکل نہ جائے کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے جس میں ظاہر ہونے والے نتائج ہی خیر و شر کا اصل معیار ہیں، اور وہ سچے دل سے یہ بات نہ مان لے کہ اصلی اور ابدی زندگی وہ ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے، اور خیر و شر کا حقیقی معیار یہ ہے کہ کس راہ پر چل کر آدمی اُس دوسری زندگی میں کامیاب ہوگا اور کس پر چل کر بُرا انجام دیکھے گا۔ یہ عقیدہ نہ ہو تو آدمی سرے سے توحید و رسالت اور ایمان بالقرآن کی دعوت کو قابلِ اعتنا ہی نہ سمجھے گا، اور اگر کسی وجہ سے اس کو مان بھی لے تو خدا کی بندگی، رسول کی اطاعت اور قرآن کی پیروی میں ہرگز سنجیدہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جب آدمی یہ سمجھتا ہو کہ آخر کار سب کو مر کر مٹّی میں مل جانا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی پیروی کرنے کی جزا اور نہ کرنے کی سزا لازماً ملنے والی ہو تو وہ کبھی ایمانداری کے ساتھ اپنے آپ کو اُس ضابطہ میں بندھوا دینے کے لیے تیار نہ ہوگا جس میں اسلام اس کو باندھنا چاہتا ہے، بلکہ زندگی کے ہر معاملہ میں وہ طریقہ اختیار کرے گا جس سے دنیا میں کچھ فائدہ، کچھ لطف اور کچھ لذت حاصل ہو، اور ہر اُس طریقے سے اجتناب کرے گا جس کی بدولت وہ حیاتِ دنیا کے فائدوں اور لذتوں سے محروم ہوتا ہو یا نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہوتا ہو۔

قریش کا آخرت کو بعید از عقل اور ناممکن سمجھنا

اس عقیدے کی یہی اہمیت تھی جس کی وجہ سے قریش اور مشرکین عرب کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسے پیش کیا تو وہ سب سے زیادہ اِسی پر چوکنّے ہوئے۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ اگر اس کو ہم مان لیں تو ہماری ساری آزادیاں ختم ہو جائیں گی۔ ہم تنہائی میں بھی، جہاں ہمیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، کوئی ایسا فعل جسے خدا اور رسول اور قرآن نے حرام کیا ہے نہ کر سکیں گے۔ ہم جہاں کوئی ناجائز فائدہ یا لطف یا لذّت حاصل کرنے پر پوری طرح قادر ہوں گے وہاں بھی یہ عقیدہ ہمارے ہاتھ باندھ کر رکھ دے گا۔ یہ تو ایک غیر محسوس سپاہی ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ لگا دے گا جو کسی حالت میں بھی ہم کو من مانی نہ کرنے دیگا۔ اِسی بنا پر وہ پوری قوت کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوگئے، اور انھوں نے بڑے زور شور سے لوگوں میں یہ خیال پھیلانے کی کوشش کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات تو قطعی خلافِ عقل ہے، بعید از امکان، سراسر دیوانگی، بلکہ محض قابلِ مضحکہ ہے۔

قرآن مجید میں اُن کے اِن خیالات کو جگہ جگہ نقل کر کے بڑے معقول دلائل کے ساتھ سب سے پہلے آخرت کا امکان ثابت کیا گیا، کیونکہ بعد کی کوئی بات انسان کے ذہن میں اُتر نہیں سکتی تھی جب تک پہلے آخرت کو ممکن ثابت کر کے اس کے عدمِ امکان کے واہمہ کا قلع قمع نہ کر دیا جائے۔

منکرین آخرت کے خیالات | کفار میں سے ایک قلیل گروہ ایسا بھی تھا جو کہتا تھا کہ ہم گمان کی حد تک تو سمجھتے ہیں کہ شاید آخرت ہو مگر ہمیں اس کا یقین نہیں ہے۔ اِس گروہ کا ذکر صرف ایک جگہ قرآن میں آیا ہے، ورنہ ہر جگہ قطعی انکار کرنے والوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کے لوگ بہت کم پائے جاتے تھے۔

پہلے گروہ کا ذکر احوال آخرت کے بیان میں صرف اِس جگہ آیا ہے:

وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللهِ حَقٌّ	اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق
وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا	ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں،
قُلْتُمْ مَّا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ	تو تم کہتے تھے کہ "ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا
إِنْ نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ	ہوتی ہے؟ ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں،
بِمُسْتَيْقِنِينَ (الجاثیہ - ۳۲)	یقین ہم کو نہیں ہے۔"

بظاہر ان دونوں گروہوں میں اس لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ ایک آخرت کا بالکل منکر ہے اور دوسرا اس کے ممکن ہونے کا گمان رکھتا ہے لیکن نتیجے اور انجام کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ آخرت کے انکار اور اس پر یقین نہ ہونے کے اخلاقی نتائج بالکل ایک جیسے ہیں۔ کوئی شخص خواہ آخرت کو نہ مانتا ہو، یا اس کا صرف گمان رکھتا ہو اور یقین نہ رکھتا ہو، دونوں صورتوں میں لازماً وہ خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کے احساس سے خالی ہوگا اور یہ عدمِ احساس اس کو لازماً فکر و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا کر کے رہے گا۔ صرف آخرت کا یقین ہی دنیا میں آدمی کے رویّے کو درست رکھ سکتا ہے۔ یہ اگر نہ ہو تو شک اور انکار، دونوں اسے ایک ہی طرح کی غیر ذمہ دارانہ روش پر ڈال دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہی غیر ذمہ دارانہ روش آخرت کی بدانجامی کا اصل سبب ہے، اس لیے دوزخ میں جانے سے نہ انکار کرنے والا بچ سکتا ہے، نہ یقین نہ رکھنے والا۔

اِس ایک مقام کو چھوڑ کر باقی تمام مقامات پر قرآن میں آخرت کا کھلا کھلا انکار کرنے والوں کے اقوال نقل کیے گئے ہیں:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا	یہ لوگ کہتے ہیں کہ "زندگی بس یہی ہماری دنیا کی

نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الجاثیہ - ۲۴ تا ۲۵)

زندگی ہے۔ یہیں ہمیں مرنا اور جینا ہے اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو" درحقیقت اس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں اور جب ہماری واضح آیات (جو آخرت پر دلالت کرتی ہیں) انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔

یعنی کوئی ذریعۂ علم ایسا نہیں ہے جس سے ان کو بتحقیق یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اس زندگی کے بعد انسان کے لیے کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی انہیں معلوم ہو گئی ہو کہ انسان کی روح کسی خدا کے حکم سے قبض نہیں کی جاتی بلکہ آدمی محض گردشِ ایام سے مر کر فنا ہو جاتا ہے۔ منکرینِ آخرت یہ باتیں کسی علم کی بنا پر نہیں بلکہ محض گمان کی بنا پر کرتے ہیں۔ علمی حیثیت سے اگر وہ بات کریں تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ بس یہ ہے کہ "ہم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں"۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم جانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے"۔ اسی طرح علمی طریقہ پر وہ یہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آدمی کی روح خدا کے حکم سے نکالی نہیں جاتی ہے بلکہ وہ محض اس طرح مر کر ختم ہو جاتا ہے جیسے ایک گھڑی چلتے چلتے رک جائے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ "ہم ان دونوں میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں جانتے کہ فی الواقع کیا صورت پیش آتی ہے"۔ اب سوال یہ ہے کہ جب انسانی ذرائع علم کی حد تک زندگی بعدِ موت کے ہونے یا نہ ہونے، اور قبضِ روح واقع ہونے یا گردشِ ایام سے آپ ہی آپ مر جانے کا یکساں احتمال ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ امکانِ آخرت کے احتمال کو چھوڑ کر حتمی طور پر انکارِ آخرت کے حق میں فیصلہ کر ڈالتے ہیں؟ کیا اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور ہے کہ دراصل مسئلے کا آخری فیصلہ وہ دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی خواہشات کی بنا پر کرتے ہیں؟ چونکہ ان کا دل یہ نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہو اور موت کی حقیقت نیستی اور عدم نہیں، بلکہ خدا کی طرف سے قبضِ روح ہو، اس لیے وہ اپنے دل کی مانگ کو اپنا عقیدہ بنا لیتے ہیں اور دوسری بات کا انکار کر دیتے ہیں۔

قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا

یہ کہتے ہیں "کیا جب ہم کر مٹی ہو جائیں گے اور

وَعِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (المومنون - ۸۲-۸۳)	ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے۔ تو ہم کو پھر زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا؟ ہم نے بھی یہ وعدے بہت سُنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سُنتے رہے ہیں۔ یہ محض افسانہ ہائے پارینہ ہیں۔
وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۔ (الرعد-۵)	اور اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ "جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے"؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔

یعنی ان کا آخرت سے انکار اور اسے بعید از امکان سمجھنا دراصل خدا سے اور اس کی قدرت اور حکمت سے انکار ہے۔ یہ صرف اتنا ہی نہیں کہتے کہ ہمارا مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ پیدا ہونا غیر ممکن ہے، بلکہ ان کے اِسی قول میں یہ خیال بھی پوشیدہ ہے کہ معاذ اللہ وہ خدا عاجز و درماندہ اور نادان و بے خرد ہے جس نے اِن کو پیدا کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۔ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۔ (سبا - ۷-۸)	منکرین لوگوں سے کہتے ہیں" ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہوگا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؛ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اِسے جنون لاحق ہے"۔

قریش کے سردار قطعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا کہہ دینے کی ہمت نہ رکھتے تھے کیونکہ پوری قوم آپ کو صادق القول جانتی تھی اور کبھی ساری عمر کسی نے آپ کی زبان سے کوئی جھوٹی بات نہ سُنی تھی۔ اس لیے وہ لوگوں کے سامنے اپنا الزام اس شکل میں پیش کرتے تھے کہ یہ شخص جب زندگی کے بعد موت جیسی اَن ہونی بات زبان سے نکالتا ہے تو لامحالہ اس کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو (معاذ اللہ) یہ شخص جان بوجھ

کر ایک جھوٹی بات کہہ رہا ہے، یا پھر یہ مجنون ہے۔ لیکن یہ مجنون والی بات بھی اُتنی ہی بے سرو پا تھی جتنی جھوٹے والی بات۔ اس لیے کہ کوئی عقل کا اندھا ہی ایک کمال درجہ کے عاقل و فہیم آدمی کو مجنون مان سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس بیہودہ بات کے جواب میں کسی استدلال کی ضرورت محسوس نہ فرمائی اور کلام صرف اُن کے اُس اچنبھے پر کیا جو زندگی بعد موت کے امکان پر وہ ظاہر کرتے تھے۔

يَقُولُونَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ (النّزعٰت - ۱۰-۱۲)

یہ لوگ کہتے ہیں "کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے جائیں گے؟ کیا جب ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے؟" کہنے لگے "یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہوگی۔"

یعنی جب اُن کو جواب دیا گیا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا تو وہ مذاق کے طور پر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یارو اگر واقعی ہمیں پلٹ کر دوبارہ زندگی کی حالت میں واپس آنا پڑا تو ہم مارے گئے، اس کے بعد تو پھر ہماری خیر نہیں۔

وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (الواقعہ - ۴۷ تا ۵۰)

اور وہ کہتے تھے "کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کے پنجر بن کر رہ جائیں گے تو پھر اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی اُٹھائے جائیں گے جو پہلے گذر چکے ہیں؟" (اے نبیؐ) اِن لوگوں سے کہو، یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔

(باقی)

تحریک اور جمود

سید اسعد گیلانی

(۲)

اسلام خود ایک تحریک بن کر آیا تھا اور اسلامی دعوت کے ہر دور میں اُس نے ایک تحریک کی طرح ہی کام کیا۔ آج بھی جب اسے غالب کرنے کا سوال سامنے آتا ہے تو درحقیقت وہ اسلام کو تحریک بنا کر از سرِ نو اُٹھانے، اُبھارنے، اور پھر قوت کے ساتھ غالب کرنے کا سوال ہی ہوتا ہے اور اس سوال کا جواب ایک فعّال اسلامی تحریک ہی ہوتی ہے۔

تحریک، ایک مسلسل عمل اسلام ایک نظامِ زندگی ہے اور کوئی نظامِ زندگی اُس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک پہلے سے قائم شدہ نظام کو ہٹا کر دوسرے نظام کے لیے جگہ خالی نہ کرائی جائے اس لیے کسی نظامِ زندگی کے غلبے کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ اسے غالب کرنے کے لیے ایک تحریک اُٹھائی جائے اور وہ تحریک اس کے غلبے تک مسلسل اور پیہم حرکت میں رہے، اپنے دامن میں نئے سے نئے افراد کو متنوع، اعلیٰ اور مختلف صلاحیتوں کے ساتھ سمیٹتی رہے، ان صلاحیتوں کو پھر وہ اِس نظام کے غلبے کے لیے استعمال کرتی رہے، اور جب تک اسلام کو کلّی غلبہ حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک نہ تحریک دھیمی پڑے، نہ جذبہ ٹھنڈا ہو، نہ نئے افراد کا آنا کم ہو، نہ پُرانے لوگوں میں جمود آئے اور نہ تحریک کے نو بہ نو پروگراموں اور پیش قدمیوں میں کوئی کمی واقع ہو۔ اسی لیے کہ تحریک کے لیے نو بہ نو پروگرام بنانا، اُس کا آگے ہی آگے پیش قدمی کرنا، اس میں نئے آنے والوں کی تربیت کر کے انہیں اخلاقی اور علمی سطح پر تحریک کے معیار کے مطابق بنانا اور اُن سے کام لینا، ایک انتہائی ناگزیر کام بھی ہے اور تحریک کی زندگی کی علامت بھی۔ اگر یہ کام ہو رہا ہو اور ہوتا رہے تو تحریک نہ صرف اُس نظام کے غالب آنے تک مسلسل فعّال متحرک اور جاندار رہتی ہے بلکہ اس نظام کے غالب ہونے کے بعد بھی اس نظام کو اس کی اصل صورت میں لانے، اُس کی مخالف قوتوں کو سرنگوں کرنے اور اس نظام کے اندر پیدا ہونے والی خرابیوں

کو رفع کرنے کا اہتمام جاری رہتا ہے جس سے ایک پائیدار نظام وجود میں آتا ہے۔

کسی تحریک کی یہ ایک بہت بڑی بدقسمتی ہوتی ہے کہ مقصد کے حصول اور نصب العین تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ منجمد اور غیر فعال ہونے لگے اور اس کے ساتھ کام کرنے والے اعضاء و جوارح اور اس کے اجتماعی ادارے تساہل کا شکار ہونے لگیں۔ تحریک ایک جوائنٹ سٹاک کمپنی کے مانند ہوتی ہے جس میں بے شمار افراد کا سرمایۂ حیات لگا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا نقصان کسی ایک فرد کا نقصان ہی نہیں، تحریک سے وابستہ سارے افراد کا نقصان، بلکہ اس معاشرے اور قوم کا اجتماعی نقصان ہوتا ہے اور یہ نقصان بھی دو نسلوں پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے کسی صالح تحریک کو ضرور کامیاب ہونا چاہیے۔ ورنہ انسانی معاشرہ تحریک کی ناکامی کی صورت میں اس نقصان کا خمیازہ صدیوں تک بھگتتا رہتا ہے اور جو لوگ اپنی بے بصیرتی، کوتاہ اندیشی، یا کوتاہ ہمتی سے اس کی ناکامی کا باعث بنے ہوتے ہیں انسانیت کی تاریخ ایسے لوگوں کو ناقابلِ معافی مجرموں کی حیثیت سے اپنے چوراہے پر مستقل لٹکا دیتی ہے۔ اس لیے کسی تحریک کا جمود جو اس کی ناکامی کا ہی ایک رُخ اور اس کا پیش خیمہ ہوتا ہے، بہت بڑا اخلاقی اور تاریخی نقصان ہوتا ہے اور جو لوگ بھی اس نقصان کا باعث بنتے ہیں وہ عنداللہ اور عندالناس دونوں جگہ ضرور ہی قابلِ مواخذہ قرار پاتے ہیں۔

تعلق باللہ میں کمی ایک اسلامی تحریک میں نفوذِ جمود کے اسباب میں سب سے بڑا اور اوّلین سبب اجتماعی اور انفرادی سطح پر تعلق باللہ میں زبردست کمی کا واقع ہونا ہے۔ تعلق باللہ میں کمی کا مسئلہ محض اخلاقی پہلو ہی نہیں بلکہ زبردست تحریکی پہلو بھی رکھتا ہے۔ اقامتِ دین کا کام آخر کس کا کام ہے؟ اسلام جو دین حق ہے اُسے غالب کرنے کا حکم آخر کون دیتا ہے؟ یہ دینِ حق پوری کائنات کا حقیقی بادشاہ کسے قرار دیتا ہے جس کے قوانین کا اجراء ضروری ہے؟ پھر اس کام کا اجر دینے والا کون ہے؟ کون اس کام میں مدد دینے والا ہے؟ ایک اسلامی تحریک کے لوگ سب مل کر کس کے لیے یہ کام کرتے اور کسے خوش کرنا چاہتے ہیں؟ معاملے کا یہ پہلو نہایت ہی اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ　　　اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔

اللہ کی مدد کس کام میں؟ اللہ کا وہ کونسا کام ہے جس کے لیے وہ اپنے بندوں کو مدد کے لیے اُبھارتا ہے تاکہ انہیں آزماتے بھی اور اجر بھی دے اور اس ذریعے سے ان کی دنیا کی زندگی میں معنی و مفہوم بھی پیدا کرے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا یہ کام اس کے دین کے غلبے کا ہی کام ہے اور اس کام میں مدد کرنا گویا اس کے اپنے ارشاد کے

مطابق اللہ کی مدد کرتا ہے۔ اس امر سے کون بے خبر ہے کہ اسلامی تحریک کا پلیٹ فارم اللہ کے اس کام کو ہی سرانجام دینے کے لیے قائم کیا جاتا ہے اور جو شخص اس کام میں کوتاہی کرتا، اس سے پہلو تہی کرتا، اور عذر و معذرت اور بہانہ جوئی کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کے اس کام میں ہی یہ سب کوتاہیاں کر رہا ہوتا ہے۔ یہی سب سے بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ اس کا تعلق اپنے رب کے ساتھ بہت کمزور ہو گیا ہے جسے مضبوط کرنے کا ذریعہ تسبیح و تہلیل سے کہیں زیادہ یہ ہے کہ وہ میدانِ عمل میں آکر اسلامی تحریک کا فعال کارکن بنے اور اپنی آخرت کی زندگی میں رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے اپنی دنیا کی زندگی میں رضائے الٰہی کے راستے پر گامزن ہو۔

یہ بات کہنا تو بہت آسان ہے کہ میرا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے اور ایک مسلمان کے لیے تو یہ بات ایک روزمرہ کا معمول ہے لیکن:۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

زبان سے کہنا اور پھر واقعی یکسو ہو کر اپنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے وقف کر دینا اور اس کے راستے میں لگا دینا اور اپنی زندگی کے لیے صرف قوتِ لایموت رکھ کر باقی سب کچھ رفاقتِ الٰہی کے حصول کے لیے اس کے کام پر نچھاور کر دینا ایمان باللہ اور تعلق باللہ کا حقیقی اور عملی مظاہرہ ہے اور یہ کام جس نسبت سے ہو، اور کسی کی طرف سے جس درجے میں اس کا عملی مظاہرہ ہو اس کا اپنے اللہ سے تعلق اسی درجے میں مضبوط اور مستحکم ثابت ہو گا۔

اللہ کے کام کے لیے اٹھنا اور پھر جانی و مالی اور جسمانی آزمائشوں کے سامنے آنے پر دائیں بائیں دیکھنا یہ اللہ کے جاں نثار بندوں کا کام نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ آزمائشوں کا دکھاوا بھی صرف انعام میں اضافہ کرنے کے لیے ہی ہوتا ہے، ورنہ یہ بار بار کا مشاہدہ ہے کہ بندے کے ظرف کو ناپ تول کر بلکہ اس سے بھی کم ہی آزمائش لائی جاتی ہے اور اس دوران میں بھی اس کی دست گیری اور ثابت قدمی و استقامت کا اس طرح پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے جیسے ماں بچے کو انگلی پکڑ کر چلاتی ہے اور اگر وہ ذرا بھی لڑکھڑاتا ہے تو اسے اپنی گود میں اٹھا لیتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ	یقیناً ان لوگوں پر جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب تو
ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ	اللہ ہے اور پھر اس قول پر پوری طرح جمے رہے،
الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا	فرشتے یہ پیام لے کر اترتے ہیں کہ نہ تمھیں کسی شے کا ڈر ہو

تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ چاہیے نہ کسی چیز کا غم، اور اس جنت پر خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

(حٰمٓ السجدہ - ۳۰)

اس تعلق کو قائم کرنے کے بعد اسے مضبوط بنانے اور مستحکم ترکرنے کے لیے ایک بیدار و باشعور اور حساس ایمان کی ضرورت ہے جو اللہ کے احسانات کا شعوری احساس رکھتا ہو۔ اسے اللہ کی صفاتِ ربوبیت، رزاقیت اور رحمانیت کا ہمہ پہلو ادراک ہو اور اپنی کوتاہیوں کے مقابلے میں اس کی رحمتوں اور نوازشوں کی وسعتوں کا تصور کر کے وہ پانی پانی ہو جائے اور اس کے احسانات کے بوجھ تلے اپنا رونگٹا رونگٹا دبا ہوا محسوس کرے۔ یہ احساس و شعور مطالعہ قرآن و حدیث اور فرائض کے ساتھ نفل عبادات کے اہتمام سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

قنوطیت تحریک میں جوش و خروش کے ساتھ شمولیت کے بعد بتدریج جوش ٹھنڈا پڑتے چلے جانے کا ایک اور سبب مایوسی اور قنوطیت بھی ہوتی ہے، یعنی اس کام کی دُنیوی کامیابی کی طرف سے مایوسی اور اس مایوسی کے سبب قوائے عمل میں تدریجی اضمحلال و افسردگی۔ یہ صورتِ حال انسان کے ارادے کی کمزوری کا نشان ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص جس عزم کے ساتھ تحریک میں آیا تھا اب وقت کے بوجھ، کام کے یکساں تسلسل، اور منزل کی دُوری نے اُسے ضعف سے دوچار کر دیا ہے اور اب اس کے لیے اسی جذبہ و شوق کے ساتھ آگے بڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ وہ اس راستے پر چلتے چلے جانے کو بھی لاحاصل سمجھنے لگتا ہے جس راستے پر اُسے منزل کا نشان دُور دُور تک نظر نہیں آتا اور غلبۂ اسلام کی جو منزل اس نے ذہن میں رکھی تھی اس کی دُوری کے سبب اس کے قدم اب سست پڑنے لگتے ہیں۔ داعیِ تحریک مولانا مودودی نے ایک جگہ اس کیفیت کا بہت خوبی سے تجزیہ کیا ہے۔

"انسان ایک تحریک کی دعوت سُن کر اسے صدقِ دل سے لبیک کہتا ہے اور اوّل اوّل خاصا جوش دکھاتا ہے۔ مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے نہ اُس مقصد سے حقیقی لگاؤ باقی رہتا ہے جس کی خدمت کے لیے وہ آگے بڑھا تھا اور نہ اُس جماعت کے ساتھ کوئی عملی وابستگی باقی رہتی ہے جس میں وہ دلی رغبت کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اُس کا دماغ بدستور اُن دلائل پر مطمئن رہتا ہے جن کی بناء پر اُس نے تحریک کو برحق مانا تھا۔ اس کی زبان بدستور اس کے برحق ہونے کا اقرار کرتی رہتی ہے۔ اس کے دل کی شہادت بھی یہی

رہتی ہے کہ یہ کام کرنے کا ہے اور ضرور ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور قوائے عمل کی حرکت سست ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کسی بدنیتی کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ مقصد سے انحراف بھی نہیں ہوتا۔ نظریے کی تبدیلی بھی قطعاً واقع نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے آدمی جماعت کو چھوڑنے کا خیال بھی نہیں کرتا۔ مگر بس وہ ارادے کی کمزوری ہوتی ہے جو ابتدائی جوش ٹھنڈا ہو جانے کے بعد مختلف شکلوں میں اپنے کرشمے دکھانے شروع کر دیتی ہے"۔

اور ارادے کی اس کمزوری کے پیچھے بالعموم وہ مایوسی اور قنوطیت ہوتی ہے جو مختلف اسباب کی وجہ دل میں گھر کر گئی ہوتی ہے۔ مایوسی اور قنوطیت شیطان کا وہ حربہ ہے جو سیدھا دل پر وار کرتا ہے اور انسان کی قوتِ عمل اور جوشِ کردار کو معطل کر کے رکھ دیتا ہے۔ ابلیس جو مایوسی کا سمبل اور نشان ہے اگر مومن کو بُرائی کے راستے پر نہیں لے جا سکتا تو اسے نیکی کے راستے پر پُرجوش تگ و دَو سے روک دیتا ہے اور یہی اس کی بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ اس کے مایوسی کے وار سے راہِ حق میں لڑنے والی فوج کا ایک سپاہی زخمی ہو جائے اور دین کے محاذ پر معطل ہو کر کاروبارِ دنیا میں کھو جائے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مایوسی کس سے ہے؟ اگر یہ کام خدا کا ہے تو کیا اس کے اجر سے مایوسی ہے؟ کیا اس کی ہمہ پہلو قدرت اور تقدیر کی ہمہ گیری سے مایوسی ہے؟ کیا اس کے عدل و انصاف سے مایوسی ہے؟ کیا اس کی پلاننگ اور اس کی مشیت سے مایوسی ہے؟ کیا اپنے کیے ہوئے کام کی قدرافزائی اور اس کی کماحقہٗ انجام دہی پر انعام و اجر کی طرف سے مایوسی ہے؟ سوچ کر بتایا جائے کہ آخر یہ مایوسی کس چیز سے ہے؟ کیا دینِ اسلام کا غلبہ کوئی ٹھیکے کا کام ہے جس کی عدمِ تکمیل پر پورا معاوضہ نہ ملنے کا خطرہ ہے؟ کیا یہ کسی کم استطاعت رکھنے والے مالک کا کام ہے جو شاید حسبِ حیثیت و کارکردگی معاوضہ دینے سے قاصر ہے؟ یہ مایوسی ایک بے دلیل، بے سبب، بے معنی، قلبی انحطاط و جمود کا نام ہے۔ ایک ایسی زمہریری سردی اور دلگرفتگی ہے جو صرف شیطان کی کارستانی سے ہی وجود میں آسکتی ہے اور جس پر ایک مردِ مومن کو لاحول پڑھ کر اللہ کے راستے پر آگے بڑھ جانا چاہیے۔

قرآن کے نشان کردہ اسباب جمود قرآن نے جہاں اللہ کے راستے میں رکاوٹوں اور اس کے دین کے لیے جدوجہد کے راستے سے روکنے والے عوامل اور اسبابِ جمود کا تذکرہ کیا ہے اور ان کا الگ الگ نام لے لے کر اُن کی نشاندہی کی ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ	اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے
وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ	بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے
وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ	عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ	اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو
اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ	خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو بہت پسند ہیں تم
فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ	کو اللہ اور رسولؐ اور اس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز تر
بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ	ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ تمہارے سامنے
الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبہ - ۲۴)	آجائے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

یہ ہیں وہ اسبابِ جمود جو اللہ کی راہ میں اُٹھنے والی اسلامی تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے کے بعد ایک مردِ مومن کی کمر کا بوجھ، اُس کے ہاتھوں کی ہتھکڑی، اس کے پاؤں کی بیڑی، اس کے نصب العین کے راستے میں بارِ گراں بننے کا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔

۱۔ رشتہ و ناتہ (باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں و دیگر عزیز و اقارب)۔

۲۔ مال و دولت (جو انسان نے کمایا ہوتا ہے)۔

۳۔ کاروبار اور تجارت (اپنی عدم توجہی اور تحریکی مصروفیات میں جن کی سرگرمیاں مدھم پڑنے کا لوگوں کو ڈر ہوتا ہے)

۴۔ پُر تکلف رہائش گاہیں (جو انسان کو بہت پسند ہوتی ہیں)

یہ وہ چار چیزیں ہیں جو انسان کو شعور کے ساتھ کسی اسلامی تحریک کا کارکن بننے کے بعد بھی اپنے اندر مبتلا کر کے اسے جمود کا شکار کر دیتی ہیں۔

رشتہ و ناتہ ہر اسلامی تحریک نے برپا ہونے کے بعد انہی چیزوں کی قربانی کا بار بار مطالبہ کیا ہے اور انہیں داؤں پر لگائے بغیر کوئی تحریک نشوونما نہیں پا سکتی۔ اسی رشتہ و ناتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے سورۃ المجادلہ کی آیت ۲۲ میں فرمایا گیا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	تو یہ کبھی نہ دیکھے گا کہ وہ لوگ جو اللہ اور
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ	آخرت پر ایمان لائے ہیں وہ ایسے لوگوں سے

حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا	دوستی کریں جو اللہ اور رسول کے مخالف ہیں۔ چاہے
اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ	وہ اُن کے اپنے باپ ہوں یا بیٹے یا بھائی
اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ ط اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ	یا قریبی عزیز۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے دلوں
قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَھُمْ	میں ایمان اتر گیا ہے اور غیب سے ان کی مدد کی
بِرُوْحٍ مِّنْہُ ط وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ	گئی ہے۔ اللہ انہیں ایسے باغوں میں داخل
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ	کرے گا۔ جن میں نہریں بہتی ہیں۔ اللہ اُن
فِیْھَا ط رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا	سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی
عَنْہُ ط اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ط اَلَآ	ہوگئے۔ یہ ہیں اللہ کا گروہ، اور اللہ
اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o	کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔

(المجادلہ ۔ ۲۲)

دنیا کی کامیاب ترین اسلامی تحریک کے سامنے جب رشتہ و ناتہ کی قربانی کا مسئلہ آیا تو اُس نے معرکۂ بدر میں اس کا حیرت انگیز نمونہ پیش کیا۔ وہ معرکہ برپا کر کے اس نے ساری دُنیا کے سامنے اپنے اللہ کا گروہ ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی مشہور تفسیر تفہیم القرآن میں لکھا ہے:

"ان کے اپنے بھائی بند سامنے تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا، کسی کا ماموں، کسی کا بھائی، اس کی اپنی تلوار کی زد میں آرہا تھا اور اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کاٹنے پڑ رہے تھے۔ اس کڑی آزمائش میں صرف وہی لوگ پورے اُتر سکتے تھے جنہوں نے سنجیدگی کے ساتھ حق سے رشتہ جوڑا ہو اور جو باطل کے ساتھ سارے رشتے منقطع کرنے پر تل گئے ہوں۔" (جلد دوم صفحہ نمبر ۱۲۶، ۱۲۷)

جنگِ اُحد میں مشہور صحابیہ خنساءؓ اپنے چاروں بیٹوں سمیت شریک ہوئیں، اپنے لڑکوں کو لڑائی میں شرکت پر خود اُبھارا اور انہیں شہادت کا شوق دلایا۔ چنانچہ وہ چاروں لڑکے لڑائی میں گئے اور چاروں ہی شہید ہوگئے۔ جب ماں کو اس کے بیٹوں کی شہادت کی خبر دی گئی تو ماں نے بیٹوں کی شہادت پر کہا:

"اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ان کی شہادت سے مجھے شرف بخشا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے

اُمید ہے کہ اُس کی رحمت کے سایہ میں ان چاروں کے ساتھ میں بھی ہوں گی۔"

سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ مجاہدین کو ہزاروں کوس دُور پردیس میں جا کر راہِ حق میں جان دینے سے کوئی رشتہ ناتہ نہ روک سکا۔ رشتے اور ناتے تو وہ عارضی تعلقات ہیں جو دنیا کی چار روزہ زندگی میں محلِ پیدائش سے وجود میں آتے ہیں اور قبر کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ حقیقی تعلق تو وہی ہے جو اللہ اور اس کا رسولؐ حقیقی یا پائیدار تعلق کے طور پر قائم رہنے دیں۔

مال و دولت مال و دولت بھی بلاشبہ راہِ حق کے راستے کا بہت بڑا پتھر ہے۔ یہ انسان کو سہولت پسند، آرام طلب، خواہشات کا بندہ اور بوجھل بنا دیتا ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ اس مال و دولت کو دائیں اور بائیں یوں اور یوں صرف کر دو تاکہ وہ حقدار کو پہنچے اور سمٹنے کے بجائے معاشرے میں پھیل جائے۔ اسی لیے خدا اور رسولؐ کی طرف سے انفاق کا بار بار حکم دیا گیا ہے تاکہ مال کی محبت دل سے نکلے۔ چنانچہ جب لوگوں نے حضور اکرمؐ سے سوال کیا کہ ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خود جواب دیا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ — آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دیجیے جو ضرورت سے زائد ہو۔

گویا اللہ کی راہ میں اسلامی تحریک کی خاطر خرچ کرنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے بلکہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ خرچ کیا جائے اور ضرورت کا تعین انسان بنیادی ضروریات کو سامنے رکھ کر اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے قلبی تعلق کو پیمانہ بنا کر جو چاہے کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ خود ایک بہت بڑا مظہرِ تقویٰ ہے اور طہارتِ نفس کا بہترین اور مؤثر ترین ذریعہ بھی صدقہ ہی ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ درحقیقت قرآن کے اپنے الفاظ میں اللہ کو قرض دینے کے مترادف ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا۔ — تم میں سے کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے؟

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مال جمع کرنے، اور پھر اسے گن گن کر اور سمیٹ سمیٹ کر رکھنے، اور پھر اس کے اپنے پاس ہمیشہ رہنے کا یقین رکھنے کے خیال کو ذریعۂ ہلاکت قرار دیا ہے۔ کتنی سچی حقیقت بیان فرمائی تھی سیدنا عیسیٰ علیہ السّلام نے جب وہ اپنے حواریوں سے یوں مخاطب ہوتے تھے:

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے

سے محبت یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز سمجھے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کرسکتے اس لیے میں کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ اُن کو کھلاتا ہے۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں سے ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں، وہ نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاتتے ہیں؛ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند ملبّس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو، تم کو کیوں نہ پہنائے گا۔ اس لیے فکرمند نہ ہو کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے۔ کل کے لیے فکر نہ کرو، کل کا دن اپنی فکر آپ کرے گا۔ آج کے لیے آج کا دکھ کافی ہے۔"

(متی باب ۶۔ آیات ۲۴ تا ۳۴)

معلوم ہوا کہ اللہ کے راستے میں ان لوگوں کے قدم تیز تر اٹھنا مشکل ہوتا ہے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے رہیں اور جب تک انہیں تحفظِ جان و مال کی مؤثر ضمانتیں نہ مل جائیں ان کے لیے قدم اٹھانا اور آگے بڑھنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ انقلابی کام تو ہمیشہ انہی لوگوں نے سرانجام دیے ہیں جو سر ہتھیلی پر لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہر بازی کھیل جائیں۔ ایسے ہی لوگ اللہ کا کلمہ بلند کرسکتے ہیں۔

اس میدان میں بھی حضور اکرمؐ کی برپا کردہ اسلامی تحریک کے کارکنوں نے حیرت ناک قربانیاں دیں اور ثابت کیا کہ مال و دولت اُن کے لیے واقعی ہاتھوں کے میل اور راستے کی گرد کے مانند تھا۔ اس لیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کے سانچے میں پورے پورے ڈھلے ہوئے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اس معاملے میں کیا ہدایات ہیں:

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ	دردناک خوشخبری سنا دو اُن لوگوں کو جو سونے
جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ	اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ
وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ	میں خرچ نہیں کرتے، ایک دن آئے گا کہ سونے چاندی

هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ (التوبہ - ۳۵)

پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا۔ لو اب اپنی ہی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا اور حضرت اسماءؓ نے اسے بیان کیا کہ:

"حضورؐ نے مجھ سے فرمایا۔ خرچ کیا کرو اور شمار نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ تم پر شمار کرے اور بند نہ رکھا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم پر بند رکھے۔ حسب استطاعت خرچ کیا کرو۔" (متفق علیہ)

ایک اور موقعہ پر ایک صحابیؓ حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"یا رسول اللہ مجھے آپ سے محبت ہے۔"

"دیکھ کیا کہتا ہے" حضورؐ نے تنبیہاً ارشاد فرمایا۔

انہوں نے پھر دہرایا اور حضورؐ نے بھی یہی جواب دیا۔ تین بار دہرانے کے بعد حضورؐ نے فرمایا:

"اچھا اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو فقر کے اوڑھنے بچھونے کے لیے تیار ہو جاؤ اس لیے کہ مجھ سے محبت رکھنے والوں کی طرف فقر ایسے دوڑتا ہے جیسے پانی ڈھلوان کی طرف۔"

جب رومیوں کے حملے کی خبر مدینہ میں پہنچی اور حضورؐ نے مقابلے کا فیصلہ فرمایا تو فوجی تیاری کے لیے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر مالی ایثار کیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے تجارتی قافلے کے دو سو اونٹ مال و اسباب کے لدے ہوئے اور مزید دو سو اوقیہ سونا اسلامی تحریک کو دیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

لَا يَضُرُّ عُثْمَانَ مَا يَعْمَلُ بَعْدَهَا

آج کے دن کے بعد سے عثمانؓ خواہ کچھ ہی کرے لیکن کوئی عمل اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ایسا ہی نقشہ ہمیں تحریکِ مجاہدین سے وابستہ لوگوں میں بھی نظر آتا ہے۔ لوگوں نے تحریک کے لیے جائیدادیں ضبط کرائیں اور جائیدادیں فروخت کر کر کے تحریک کو تقویت پہنچائی اور سب کچھ بیچ کر تحریک کے قافلۂ جہاد میں فقیر بن کر شریک ہو گئے۔

کاروبار اور تجارت تجارت اور کاروبار تو موجودہ دورِ معاشیات میں اس راستے کی بہت ہی بڑی چٹان ہے۔ اگر یہ تحریک کو مالی تقویت پہنچانے میں مددگار ہوں تب تو ان کی افادیت مُسلّم ہے۔ لیکن اگر یہ راہِ حق

میں قدم اُٹھانے میں پاؤں کی بیڑی بن جائیں اور انسان اس میں دفن ہو کر اس طرح اس میں پابند ہو جائے جس طرح مُردہ قبر میں دفن ہو کر اس کا پابند ہو جاتا ہے ، تو پھر یہ راہِ حق کا ایک ایسا پھندا ہے جسے انسانی زندگی میں اس کی حیثیت کے مطابق محدود اور قابو میں رکھنا مردِ مومن کا فرض بن جاتا ہے ۔ یہ بھی آخرت فراموشی کا ہی ایک پہلو ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے معاملات میں گردن تک دھنسا ہوا اپنے سارے فرائض اور دوسروں کے سارے حقوق سب کچھ بھول جاتا ہے ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت دُنیا سے بدرجہا بہتر ہے ، لیکن حاضر و موجود میں مبتلا انسان غائب و غیر محسوس آخرت کا ادراک و احساس کرنے میں کوتاہی کرتا ہے ۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۔

تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے ۔

دوسری جگہ کاروبارِ دُنیا کی مرغوبیت پر تبصرہ کرتے ہوئے خود قرآن نے فرمایا :

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○ (آل عمران - ۱۴)

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس ، عورتیں ، اولاد سونے چاندی کے ڈھیر ، نشان لگے ہوئے گھوڑے ، مولیشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں ۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ ہی کے پاس ہے ۔

اب یہاں کاروبارِ دنیا کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے چند مزید اسبابِ جمود کا تذکرہ کیا ہے ۔ جن میں پہلی چار چیزوں کے علاوہ دو چیزوں کا مزید اضافہ کیا گیا ہے ۔

۵ ۔ مولیشی (دُودھ والے ، سواری والے ، اور زمینیں جوتنے والے جانور) ۔

۶ ۔ زرعی زمینیں (فصلیں ، باغات ، ٹیوب ویل اور متعلقہ ساز و سامان) ۔

ظاہر ہے کہ مولیشیوں کے اوقاتِ کارکردگی کے ساتھ بندھا ہوا مجبور و پریشان انسان اور زمینوں کی فصلوں کا سخت پابند آدمی کسی انقلابی تحریک کے ساتھ کیا انقلابی کارنامے سرانجام دے سکتا ہے جب

تک اس کا انقلابی جذبہ ان چیزوں کو اس کے اصول و نظریے کا پابند نہ بنائے اور ان کاموں کے پروگراموں کو اپنے تحریکی پروگراموں کے تحت نہ رکھے؟

اللہ تعالیٰ نے دین کے کام کے لیے بھی اپنے بندوں سے اس کاروبار اور تجارت کی اصطلاح میں بھی بات کی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ	اے مسلمانو! کیا میں تمہیں ایسی سوداگری بتاؤں
عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ	جو تم کو آخرت میں دردناک عذاب سے بچالے؟
اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان
وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے
بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ	جہاد کرو۔ اگر تم سمجھو تو یہ تجارت تمہارے حق
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝	میں زیادہ بہتر ہے۔

(صف - ۱۰ - ۱۱)

چنانچہ حضورؐ اکرم کی تحریک کے کارکنوں نے اللہ کے ساتھ ایسی ہی تجارت کی اور اس تجارت کی انتہائی درخشاں مثالیں پیش کیں۔ اسی لیے وہ تھوڑے سے وقت میں بہت بڑا انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضورؐ اکرم نے خود اپنے جمے جمائے پھیلے پھیلائے وسیع کاروبار کو تحریک کی ضروریات کی خاطر اللہ کی راہ میں بالکل بیٹھ جانے دیا اور اپنی ساری مساعی کا محور و مرکز صرف اللہ کے دین کی سربلندی کو ہی قرار دے لیا۔ یہی حال اُن کے دوسرے ساتھیوں کا ہوا۔ جو لوگ ملک چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے آخر وہ اپنے کاروباروں کو ٹھپ کر کے ہی جا سکے۔ اور جو لوگ اپنے کاروبار مکّہ میں چھوڑ کر مدینے کی طرف ہجرت کر گئے ظاہر ہے کہ وہ اپنے کاروبار اپنے ساتھ تو نہیں لے گئے تھے۔ انہوں نے اسلامی تحریک کے لیے قربانی کی ایسی اجتماعی مثال پیش کی جس کا نمونہ انسانی تاریخ میں دوسرا کوئی نہیں ملتا۔

حضرت صُہیبؓ رُومی مکہ میں بہت بڑے تاجر اور کاروباری تھے۔ جب وہ ہجرت کے لیے اپنا سروسامان لے کر شہر سے باہر نکلے تو قریشِ مکّہ نے پکڑ لیا اور کہا کہ "یہاں جب تم ہمارے شہر میں آئے تھے تو خالی ہاتھ آئے تھے تم نے ہمارے ہی شہر میں کاروبار اور تجارت کر کے اتنا اثاثہ بنا لیا۔ اب اسے کہاں لیے جاتے ہو ــــ" حضرت صُہیبؓ رُومی نے اپنا سب کچھ ان کے حوالے کیا اور تہی دست ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب

وہ مدینہ میں پہنچے تو حضور اکرمؐ تک صحابہؓ نے صہیبؓ کے یوں لٹ پٹ کر خالی ہاتھ پہنچنے کی خبر سنائی۔ حضورؐ نے صہیبؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "صہیبؓ تم نے اپنے رب کے ساتھ بہت اچھا سودا کیا، مبارک ہو۔" یہ بات کہنے والے بھی جانتے تھے اور سننے والے بھی کہ واقعی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اتنا بڑا محفوظ سودا ہے جس کے نفع کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بس اس کے لیے خلوص اور انتظار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کئی گنا ہو کر اس وقت اسے واپس ملے گا جب اسے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ ساتھ ہی اسے مزید اپنے رب کی خوشنودی ملے گی جو انمول ہے اور جس کا کوئی شے بھی بدل نہیں ہے۔

اسی طرح بعد میں بھی جن لوگوں نے اسلامی تحریک کا کام کیا انہوں نے اپنے کاروبار اور تجارت کو اس راہ میں ہمیشہ قربان کیا۔ تحریک مجاہدین سے وابستہ ہزاروں مجاہدین اپنے کاروبار چھوڑ کر تحریک میں شامل ہوئے اور سرحد میں جا کر محاذِ جنگ میں شہید ہوئے۔ ہزاروں لوگ کاروبار میں کئی کئی ماہ تک غیر حاضر رہتے۔ محاذ پر جا کر مجاہدین میں شامل ہو کر جہاد کرتے اور پھر واپس آکر کاروبار میں مصروف ہو جاتے تاکہ تحریک کو مالی امداد بھی پہنچائی جا سکے۔ جو لوگ تحریک سے مالی تعاون کرتے رہے ان کی جائیدادیں اور کاروبار کافر حکومت نے ضبط کیے اور انہوں نے ہنسی خوشی یہ قربانیاں گوارا کیں تاکہ وہ اپنے مالکِ حقیقی کو خوش کر سکیں اس لیے کہ وہی ہر شے کا مالک ہے اور ہر شے اسی کی طرف سے ہے۔

پُرتکلف رہائش گاہیں

گھر بار اور پُرتکلف رہائش گاہیں بھی انسان کے لیے اسلامی تحریک کے راستے کا پھندا بن جاتی ہیں۔ انسان کے لیے اپنے آباد گھروں سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اپنے معمولات کو چھوڑنا اور غیر معمولی حالات سے دوچار ہونا مشکل ہوتا ہے۔ لوگوں کے لیے گھروں سے باہر دشواریاں اور تکالیف اور دیگر مشکلات برداشت کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اپنے معمول کے کھانے، معمول کے بستر، معمول کے کام کاج، چاروں طرف اپنے بیوی بچے اور عزیزوں کے پُرمحبت چہرے اور ان کی قربت اور رہائش آخر کسے پسند نہیں ہے۔ لیکن اللہ کا حکم تو یہی ہے کہ اس کے راستے میں، جب اس کے دین کا مطالبہ ہو، اور جب اسلامی تحریک کا پروگرام سامنے آئے تو ان مرغوباتِ نفس کو قربان کر کے راہِ حق میں نکلا جائے۔ جس درجے میں کوئی شخص ان چیزوں کے گھیراؤ میں زیادہ پھنسا ہوا ہوگا اسی قدر وہ بوجھل ہوگا اور جس قدر اس کے گرد ان چیزوں کا گھیرا کم ہوگا اسی درجے میں وہ ہلکا ہوگا۔ لیکن اللہ کا دین جب غالب نہ ہو تو اس کا مطالبہ یہی ہے کہ دین کی سربلندی کے لیے اسلامی تحریک کی جدوجہد کے لیے نکلو۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا نکلو اللہ کی راہ میں ہلکے ہو یا بھاری۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کیفیتِ قلبی کو خوب جانتا ہے اور ان کے مرغوبات سے بھی خوب آگاہ ہے اس لیے کہ وہ خالقِ فطرت ہے۔ چنانچہ دین کے لیے جد وجہد کرنے والے مجاہدین سے ان مرغوبات کی قربانی طلب کر کے، پھر آخرت میں ان سے لاکھوں گنا بہتر مرغوبات کا وعدہ بھی بار بار کیا گیا ہے، گویا ان تمام مرغوبات کو مستقل پائیدار اور کامل صورت میں پالینے اور حقیقی طور پر متمتع ہونے کا مقام دُنیا نہیں بلکہ آخرت ہے جہاں مَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ دینے کا وعدہ مضبوط اور پختہ ہے، جس کے بعد اُنہیں چھوڑنے کا دوبارہ مطالبہ نہ کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں بھی اسلامی تحریک سے وابستہ لوگوں نے بہت درخشاں مثالیں پیش کی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے سامنے یہ مسئلہ آیا تو وہ دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور دعوتِ دین کی خاطر دیس دیس کی خاک چھانتے رہے۔ حضرت موسیٰؑ کے سامنے آیا تو انہوں نے بھی ساری عمر مسافرت اور صحرا نوردی میں ہی گذار دی۔ اور جب حضورؐ اکرم کی مثالی اسلامی تحریک کے سامنے آیا تو اُس کے کارکنوں نے بھی اپنے بھرے ہوئے گھر، چلتے ہوئے کاروبار، اور آباد گھرانے چھوڑ کر خالی ہاتھ پردیس کا راستہ اختیار کیا اور کسی کی پُرآسائش رہائش گاہ بھی اس کا راستہ نہ روک سکی۔ اسی طرح مجاہدین کی تحریک میں بھی ہزاروں لوگوں نے اپنے گھر بار چھوڑ دیے اور پردیس میں نکل گئے اور اس طرح نکلے کہ بظاہر انہیں دوبارہ ان گھروں میں واپس آنے کی کوئی اُمید نہ تھی اس لیے کہ انہیں حتمی ایمان حاصل تھا کہ:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَ جٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ لا اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ	اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا بڑا درجہ ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جانفشانیاں کیں۔ وہی کامیاب ہیں۔

(التوبہ - ۲۰)

پھر مزید فرمایا گیا:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰھَدُوْا	جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب ایمان لانے کی وجہ سے ستائے گئے تو انہوں نے گھر بار چھوڑ دیے

وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ — ہجرت کی، راہِ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا - ان کے لیے یقیناً تیرا رب غفور و رحیم ہے ۔

(النحل - ۱۱۰)

عزم گھروں سے نکلنے اور راہِ حق میں جانگسل جدوجہد کی مثالیں اسلامی تحریک کی تاریخ میں ہر دور میں موجود ہیں اور پھر جس قدر درخشاں مثالیں کسی تحریک نے پیش کی ہیں اسی قدر خوش آئند اور پائیدار نتائج اس کے برآمد ہوئے ہیں ۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ رب العالمین اپنے بندوں کو ان کی مرغوباتِ نفس کے ذریعے اپنے دین کی خاطر آزماتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ ان مرغوبات کے مقابلے میں اللہ کے دین کے کام کو کس درجہ ترجیح دیتے ہیں - پھر جس درجے میں کوئی تحریک ایثار و قربانی کے اس میدان میں عمدہ اور کثیر مثالیں پیش کرتی ہے ۔ درخشاں اور قریب تر نتائج ضرور اس کے حصے میں آتے ہیں اور جس درجہ میں کسی تحریک کے کارکن مرغوباتِ نفس یعنی اسبابِ جمود سے چمٹے رہ جاتے ہیں اسی درجہ میں دنیا میں خوش آئند نتائج اور آخرت میں مالک کی رضا کا حصول دور تر ہوتا چلا جاتا ہے ۔

(باقی آئندہ)

رسائل و مسائل

انفاق فی سبیلِ اللہ کے باوجود مال میں کمی کیوں؟

ملک غلام علی

سوال:- میں آج کل سخت ذہنی پریشانی بہ الفاظ دیگر ایمانی پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہوں، شیطان کے حملوں کی زد میں ہوں۔ الحمدللہ اپنی زندگی دیندارانہ ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی جب سے اسلام کو شعوری طور پر قبول کیا ہے، حلال و حرام، جائز و ناجائز کی قیود کے ساتھ گزاری ہے۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے میری معاشی زندگی بے حد تنگ تھی بعد کو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے آہستہ آہستہ بتدریج کاروباری حالات بہتر ہوتے گئے اور میں صاحب نصاب ہو گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ایسا ہوا اور چار پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ میں اس قابل ہو گیا کہ ایک ہزار روپیہ زکوٰۃ ادا کر سکوں۔ اس کے بعد گذشتہ تین سال سے یہ صورت حال واقع ہوئی ہے کہ میں کاروباری اور دیگر مصائب مثلاً بچوں کی بیماریوں اور دوسری پریشانیوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا اور اس دوران میں بھی ایمان اللہ کی رحمت سے سلامت رہا، اور اب تک ہے۔ میں نے کاروباری بحران پہ قابو پانے کے لیے کسی ناجائز حربہ کو استعمال کرنے سے الحمدللہ گریز کیا۔

اس سال میں نے اپنی زکوٰۃ کا حساب کیا تو وہ گذشتہ تین سال سے جو بتدریج کم ہو رہی تھی، ایک ہزار سے گھٹ کر پانچ سو رہ گئی ہے۔ کچھ سرمایہ نقصانات کی نذر ہوا اور کچھ کاروباری بحران اور اخراجات کی نذر ہوتے ہوتے نصف رہ گیا ہے۔ زکوٰۃ کے علاوہ بھی میں تمام دینی واجبات ادا کرتا رہا ہوں۔ اور کردار بھی انشاءاللہ مومنانہ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا اور یہ معمہ حل نہیں ہوتا کہ مجھے خسارہ کیوں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ شکر کا رویہ (شکر کے معنی خدا کی نعمتوں کی قدردانی اور ان کا صحیح استعمال) اختیار کریں گے،

ہم ان کے لیے اپنی عطا کردہ نعمتوں میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ اور میں نے الحمد للہ شکر کا رویہ ہی اختیار کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میرے زوالِ نعمت میں اللہ تعالیٰ کی کون سی حکمت کارفرما ہے اور ایسی صورت حال میں جو میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے وہ کس قانونِ خداوندی کے ماتحت ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ حلال و حرام کی حدود سے ناآشنا، خالص زرپرست، دنیادار میرے گردوپیش میں ہیں وہ خوب پھل پھول رہے ہیں۔ میرا خاندان ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل ہے اور وہ سب آسودہ حال دن دونی رات چوگنی مالی ترقی کر رہے ہیں، اور میں ان کے درمیان تنہا ایک ذات جو دن بدن پریشانیوں اور مالی زوال کا شکار ہوں۔ حالانکہ ان سب میں دیندار بھی میں تنہا ہوں ذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ۔ اس صورت میں شیطان مجھ پر حملہ آور اور میرے عقائد میں تزلزل پیدا کر رہا ہے کہ اللہ میری زکوٰۃ جو میں اس کی راہ میں دیتا ہوں اسے کم کیوں کرتا جا رہا ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق تو یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے مال بڑھتا ہے گھٹتا نہیں پھر میں خوشحال ہونے کے بجائے کیوں خستہ حال ہوں؟

جواب: آپ کی ذہنی پریشانی کا حال معلوم کر کے افسوس ہوا۔ جس تفصیلی انداز سے آپ نے اپنا مسئلہ بیان کیا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اسی نسبت سے مدلل و مفصل جواب آپ کو دے سکوں گا یا نہیں۔ تاہم مختصر جواب عرض کرتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اسے ہی کافی و شافی بنا دے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی الجھن کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ کتاب و سنت کی تعلیمات کو ان کی مجموعی حیثیت میں پیشِ نظر نہیں رکھتے اور پھر ان کے کسی ایک جزء کو بھی سامنے رکھتے ہوئے اس خاص جزء کے صحیح پس منظر اور مفہوم کو نظرانداز کر کے اسے ایک محدود معنی پہنا دیتے ہیں۔ آپ خود دیکھیں کہ جس خاص مسئلے میں آپ کو الجھن پیش آ رہی ہے وہ زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کا مسئلہ ہے۔ آپ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جو شخص زکوٰۃ دیتا رہے اس کا مال ہمیشہ دنیا میں بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اور جو نہ دے اس کے مال کی مقدار دنیا میں گھٹتی ہی چلی جائے گی۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات قرآن و حدیث کے کس مقام پر کہی گئی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی گارنٹی اگر خدا اور رسولؐ کی طرف سے دے دی جاتی جو یقیناً پوری بھی ہو کر رہتی تو پھر کون شخص ایسا ہوتا جو زکوٰۃ دینے سے باز رہتا اور ا فزائش مال کے اس تیر بہدف نسخے کو آزمانے میں کوتاہی کرتا۔ پھر تو انفاق میں قربانی، ایثار اور آزمائش کا پہلو بالکل ہی

ختم ہو جانا۔ اپنے اس استدلال کو اگر آپ ذرا پھیلا دیں تو اس سے یہ بھی لازم آئے گا کہ جو مسلمان بھی اللہ کے اوامر و نواہی کی پابندی کرے گا اسے دنیا میں کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور وہ ہمیشہ مزے ہی لوٹتا رہے گا، دنیوی مال و متاع اور آرام و آسائش اسے دائماً حاصل رہیں گے، ان میں کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ ہر لحاظ سے زیادتی اور افزونی ہی ہوتی چلی جائے گی۔ آپ خود سوچیں اور پھر مجھے بتائیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر کون احکام الٰہی کا متبع ہوگا اور کس نے زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی میں ان سے بڑھ کر پابندی کی ہوگی۔ پھر کیا ان پر فقر و فاقہ، معاشی تنگی اور دوسرے مصائب و شدائد وارد نہیں ہوئے اور ان سے نہیں فرمایا گیا کہ:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝	اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے خوف، بھوک اور مال، جان اور پیداوار کے نقصانات کے ذریعے سے اور بشارت دو صبر کرنے والوں کو جنہیں مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف واپس ہونے والے ہیں۔

آزمائش تو ہر انسان کے لیے ناگزیر ہے، البتہ اس کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ کسی کو اللہ مال دے کر آزماتا ہے اور کسی سے چھین کر آزماتا ہے۔ کسی کو فرمانبرداری کی حالت میں بھی مبتلائے تکلیف رکھتا ہے اور کسی کو نافرمانی میں بھی ڈھیل دیتا ہے اور یہ آخری صورت سب سے زیادہ سخت آزمائش کی صورت ہے۔

آپ نے قرآن مجید کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ سورۂ ابراہیم آیت ۷ ہے۔ اس میں خطاب کسی فرد یا چند افراد سے نہیں بلکہ پوری قوم بنی اسرائیل سے ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بہت سے دوسرے ایسے وعدے ہیں جن کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ جماعت سے ہے۔ بعض اوقات ان وعدوں میں ایسی عمومیت پائی جاتی ہے کہ برسوں نہیں بلکہ صدیوں میں اور بعض کی دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں تکمیل ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زکوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ کسی شے کو پاک صاف کر کے اسے نشوونما دی جائے اور اس میں بالیدگی پیدا کی جائے۔ لیکن اس کا مطلب ہر حالت میں مال کی مادی مقدار کا بڑھنا نہیں بلکہ اس کا تعلق دراصل آخرت کے اجر و ثواب سے ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ (النحل - ۹۶) جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے وہ باقی رہتا ہے۔

یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ زکوٰۃ سے دُنیا میں معاشی خوشحالی پیدا ہوتی ہے مگر اس کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ پورے معاشرے سے ہے۔ پورا معاشرہ اگر زکوٰۃ پر عامل ہو تو بلاشبہ دولت کی گردش امیروں سے غریبوں کی طرف ہوتی ہے اور ہر شخص آسودہ حال ہوتا ہے۔ مگر سو یا ہزار میں سے ایک اگر زکوٰۃ دے اور باقی زکوٰۃ نہ دیں، بلکہ اُلٹا سود کھائیں تو پھر پوری سوسائٹی کیسے پھلے پھولے جب کہ اللہ نے صدقات و زکوٰۃ کی افزائش کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ سودی کاروبار تباہی بھی لاتا ہے۔ لکھنے کو تو بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن زیادہ تفصیل و اطناب میرے لیے ممکن نہیں۔ خدا کرے یہ مختصر جواب آپ کے لیے موجبِ طمانیت ہو جائے اور آپ وسوسۂ شیطان سے بچ جائیں۔

(بقیہ اشارات) اور تصورات کو بدل دینے کی کوشش کی گئی اور انہیں یہ باور کرایا گیا کہ انگریز کا تسلط لعنت نہیں بلکہ سراپا رحمت ہے اور اس کی غلامی اور چاکری ہی میں مسلمانوں کی فلاح و کامرانی کا راز مضمر ہے۔

ابھی یہ سطور لکھی جارہی تھیں کہ سوات کے گردو نواح میں قیامت خیز زلزلے اور اس کے نتیجے میں جان و مال کے ناقابلِ بیان نقصان کی خبریں آنے لگیں۔ یہ ایک ایسا دلفگار حادثہ ہے جس نے ہر حساس شخص کو سوگوار بنا دیا ہے۔ کوئی آنکھ نہیں جو مرنے والوں اور زندہ بچ جانے والی بیواؤں اور یتیموں کے غم میں نمناک نہ ہو۔ ہر صاحبِ دل افسردگی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ آدمی جب اس المیہ سے متاثر ہونے والے افراد کے مصائب اور آلام کا تصور کرتا ہے تو کانپ اُٹھتا ہے۔ انسان تو ایک طرف رہے ایسے حادثات پر تو خود فطرت خون کے آنسو بہاتی ہے۔ وہ لوگ جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ ایسے پریشان کن حالات میں اُس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسے قدرت کا ایک تازیانہ سمجھ کر اس سے عبرت پکڑتے اور اصلاح نفس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور الحاح و تضرع کے ساتھ اپنے خالق و مالک سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں لیکن پاکستانی مسلمانوں کے شب و روز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر سخت بے حسی کا عالم طاری ہے اور اس المناک حادثہ کے رونما ہونے کے بعد بھی خدا کی نافرمانی پر انہیں شدید اصرار ہے گویا کہ وہ خدا کے غضب کو بھڑکانے کا تہیہ کرچکے ہیں۔

جس روز پاکستان کے ایک حصے میں یہ قیامت برپا تھی اُس سے دوسری رات لاہور کے مختلف ہوٹلوں میں عیش و نشاط کی محفلیں پوری ڈھٹائی کے ساتھ منعقد کی گئیں اور ان میں لاکھوں روپے ایسی اخلاق سوز حرکات پر صرف کیے گئے جن سے خدا اور اُس کے رسولؐ نے بڑی سختی سے منع کیا ہے اور جو ماضی اور حال میں قوموں کی تباہی کا موجب بنی ہیں۔ مسلمانوں کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ خداوند تعالیٰ دنیا کو فساد سے پاک رکھنے کا التزام کرتا ہے اور جب فسق و فجور بڑھ جائے تو وہ فساق و فجار کے لشکروں کو تباہ کرکے اپنی زمین کا انتظام ان لوگوں کے سپرد کرتا ہے جن کے دم قدم سے بنی نوع انسان کی اخلاقی صحت قائم رہتی ہے لیکن جب اس کی بندگی کے دعویدار اس کی بغاوت پر اُتر آئیں اور فسق و فجور میں مبتلا ہوکر قوم کے اخلاق تباہ کرنے کے درپے ہوجائیں تو خداوند تعالیٰ صرف اُن کی آزادی ہی سلب نہیں کرتا بلکہ انہیں نوع انسانی کے لیے سامانِ عبرت بنا دیتا ہے۔

پاکستانی ہونے کی حیثیت سے ہمیں اس حقیقت کو ذہن میں تازہ رکھنا چاہیئے کہ قیام پاکستان کے وقت خدا اور خلق کے سامنے ہم نے جو عہد و پیمان کئے تھے وہ آج تک ہمارے ذہنوں ہی میں محفوظ نہیں بلکہ ہماری تاریخ کا حصّہ بن چکے ہیں۔ مملکت پاکستان کے مجموعی طرز عمل کو دیکھتے ہوئے اور موجودہ برسر اقتدار طبقے کے متضاد و مختلف اعلانات و بیانات کو سننے کے بعد اندرون اور بیرون ملک یہی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان مقدس عہد و مواثیق سے ہم قومی سطح پر روز بروز انحراف کرتے جا رہے ہیں۔ اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے، اسلامی نظام نافذ کرنے اور افراد ملت کے انفرادی و اجتماعی کردار کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے والی ساری باتیں جب ہم ایک ایک کرکے فراموش کرتے جائیں اور ان کی جگہ غیر اسلامی سرگرمیوں پر اترانے لگیں تو ہم رحمتِ خداوندی سے کس طرح ہمکنار ہو سکتے ہیں یہ باغیانہ روش تو اُس کے غضب کو ہی دعوت دینے والی ہے۔ زلزلہ سوات کا یہی وہ فکری پہلو ہے جسے ہم قوم کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں راہ راست دکھائے اور ماضی میں جو جو کوتاہیاں ہم سے سرزد ہوئی ہیں، ان کی تلافی کی توفیق عطا فرمائے۔ اور آخرت میں ہمیں رسوا نہ کرے۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه

آمین اله الحق آمین

خریدارانِ ترجمان القرآن سے

التماس

۱۔ چندہ کے منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ صاف اور خوشخط لکھیئے خصوصاً ڈاک خانہ اور ضلع کا نام انگریزی کے بڑے حروف میں درج کیجیے۔ سابق نمبر خریداری بھی۔

۲۔ تبدیلیٔ پتہ کی فرمائش مہینہ کی پندرہ ۱۵ تاریخ تک دفتر کو پہنچ جانی چاہیئے جس میں پہلا اور نیا تبدیل شدہ پتہ دونوں نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ درج ہوں۔

۳۔ اجرائے رسالہ کے لیے پیشگی چندہ بھیجیئے یا وی پی کی اجازت دیجیئے۔ قرض یا وعدہ پر رسالہ جاری نہیں کیا جاتا۔

اگر خدانخواستہ آپ ان گذارشات کو نظر انداز کریں گے تو دفتر کی مجبورانہ کوتاہیوں کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

"مینجر"

مطبوعات

فقہائے ہند جلد اول

مؤلف: مولانا محمد اسحاق بھٹی

ناشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ لاہور

سفید کاغذ۔ سائز ۲۳ × ۳۶ / ۱۶

صفحات: ۲۳۲ قیمت مجلد: ۱۳/۷۵ روپے

اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ہندوستان کے فقہا و علمائے اسلام کا تذکرہ ہے۔ محترم مؤلف نے زیر نظر تالیف کی جلد اول میں پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کے فقہائے اسلام کے مختصر سوانح بیان کیے ہیں۔ فاضل مصنف نے بیشتر فقہائے کرام کے متعلق محض تعارف پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے البتہ بعض معروف بزرگوں کے حالات مفصل مل سکے ہیں ان کے نام و نسب اور تحصیل علم کے علاوہ ان کی دینی خدمات پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔

شروع میں ابتدائیہ کے عنوان سے ایک بیش قیمت علمی و تحقیقی مقالہ درج ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ عہدِ خلافتِ راشدہ میں ہی بعض جنگی مہمات کے ضمن میں عساکر اسلام کے ہمراہ صحابہ و تابعین برصغیر ہند کی طرف تعلیم و تبلیغ کی غرض سے تشریف لائے اور بعد ازاں اموی خلافت کے دوران بھی یہ تبلیغی کام مسلمان خلفاء و امراء کی سرپرستی میں برابر آگے بڑھتا رہا۔ اس کے بعد ہند کے شمال مغرب سے مسلمان سلاطین برصغیر میں وارد ہونے لگے جن میں سرِ فہرست محمود غزنوی کا نام نامی ہے۔ یہ تمام مسلم ملوک و امراء اشاعتِ اسلام کے مبارک مشن کی تکمیل میں کوشاں رہے۔

ہماری رائے میں "فقہائے ہند" کی تالیف نہایت مستحسن کاوش ہے اور اس پر محترم مؤلف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ پاکستانی نوجوانوں کو اس کتاب کے مطالعہ سے اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقفیت بہم پہنچ سکے گی۔

امن عالم اور اسلام

تالیف: سیّد قطب شہید
ترجمہ: پروفیسر منظور احمد صاحب۔
شائع کردہ: گلستان پبلیکیشنز۔ ۴۰۔ اُردو بازار، لاہور

صفحات: ۲۴۴ قیمت: ۱۸/- روپے ڈیلکس ایڈیشن: ۲۴/- روپے

سیّد قطب شہید نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دورِ جدید کے بہت سے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کیا ہے اور اس ضمن میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے امن عالم کے قیام میں اسلام کے کردار کو نمایاں کیا ہے۔ اسلام ایک مسلمان کو قلبی طور پر امن و سکون سے ہمکنار کرتا ہے۔ اس کی گھریلو فضا اور اس کا معاشرتی ماحول پر امن بنا دیتا ہے۔ حتّٰی کہ اس کی دنیا کو عالمگیر سطح پر جنّت کا گہوارہ بنا دیتا ہے بشرطیکہ اسے نفوذ و سرایت کا موقع دیا جائے۔

جناب منظور احمد صاحب کا ترجمہ سلیس اور رواں ہے اور گلستان پبلیکیشنز نے کتابت و طباعت کا اچھا معیار پیش کیا ہے۔ ۲۴۴ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۲۴/- روپے البتہ زیادہ ہے۔

کتاب الفوائد المشوق الی علوم القرآن و علم البیان

تالیف: الامام ابن قیم الجوزیہ
ناشر: دار نشر الکتب الاسلامیہ۔ ۱۹ گورونانک پورہ۔ گوجرانوالہ
سفید کاغذ۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ عربی ٹائپ

صفحات: ۲۶۰ قیمت: ۱۵/- روپے

قرآنِ پاک کی فصاحت و بلاغت کے موضوع پر عربی زبان میں امام ابن قیم کی یہ کتاب بڑی وقیع ہے۔ اس میں امام موصوف نے ڈیڑھ سو کے قریب ایسے عمدہ اسالیبِ بیان اور اصنافِ سخن کا ذکر کیا ہے جن سے کلامِ الٰہی آراستہ و مزین ہے۔ ہر صنفِ سخن کی مختصر تعریف کرنے کے بعد متعلقہ آیاتِ قرآنی کو بیان کیا ہے اور لغتِ عرب اور اشعارِ عرب سے بھی امثلہ و شواہد پیش کئے ہیں۔ آخر میں اعجاز القرآن تلوین الخطاب اور دیگر اہم قرآنی مباحث پر بھی محققانہ کلام فرمایا ہے۔

ہم اس نایاب علمی کتاب کی اشاعت پر دار نشر الکتب الاسلامیہ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔